معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس[۲۵] پونڈ یا چالیس[۴۰] ڈالر

بحری ڈاک نو[۹] پونڈ یا چودہ[۱۴] ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۵ ماہ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۰۵ء عدد ۵

فہرست مضامین

ای میل: email : shibli academy @ rediffmail. com

☆☆☆

شذرات

ملک آزاد ہوا تو اس میں مسایل کا انبار بھی لگ گیا لیکن یہ تعجب خیز نہیں کیوں کہ عموماً ہر انقلاب کے بعد پیچیدہ حالات اور گوناگوں مسایل سر اٹھا ہی لیتے ہیں، تعجب تو اس پر ہے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی ملک ان حالات اور مسایل پر قابو نہیں پا سکا ہے، بلکہ مزید نئے نئے لاینحل مسایل پیدا ہوتے جارہے ہیں، ان مسایل میں بعض سے تو پورا ملک اور اس کے سب ہی باشندے دوچار ہیں لیکن بعض مسایل کا سامنا صرف مسلمانوں ہی کو کرنا پڑ رہا ہے، ان کے مسایل دو طرح کے ہیں، ایک خود ان ہی کے پیدا کردہ ہیں اور دوسرے مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور اکثریت کے جارحیت پسند طبقوں کی دین ہیں جن کا سلسلہ ختم ہونے کے بجائے بڑھتا، الجھتا اور پیچیدہ ہوتا جارہا ہے اور ان کی وجہ سے آزاد ہندوستان کے نقشے میں مسلمانوں کی تصویر بہت دھندلی اور مدھم ہوتی جارہی ہے اور وہ بالکل حاشیے اور کنارے پر پہنچتے جارہے ہیں مگر کسی ملک کو مہذب اور ترقی یافتہ اسی وقت کہا جائے گا جب وہاں کے سارے لوگ اور ہر مذہبی و لسانی گروہ آسودہ اور مطمئن ہو۔

مسلمان عموماً اس صورت حال کی ساری ذمہ داری حکومت اور دوسروں پر ڈال کر ملک کے عام حالات اور قومی سرگرمیوں سے کنارہ کش اور بے تعلق رہتے ہیں، اس کی وجہ سے سیاسی، انتظامی اور قومی زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کا تناسب بہت کم ہوگیا ہے، یہ صحیح ہے کہ سیکولر ہونے کے باوجود ملک کی اکثر سرگرمیاں ایک مخصوص مذہب کے رسم و دستور کے مطابق انجام پارہی ہیں جن میں سے اکثر تو اسلامی طریقے کے منافی بلکہ مسلمانوں کے عقاید کو مجروح کرنے والی بھی ہیں اور جو مسلمان ان میں شریک ہوتے ہیں ان میں اتنی جرأت و ہمت کہاں کہ وہ اپنے کو ان میں ملوث ہونے سے بچا سکیں لیکن مسلمانوں کی تاریخ اور امتیاز یہ رہا ہے کہ وہ جس ملک میں

گئے اس سے بے تعلق اور بے گانہ نہیں رہے بلکہ اس کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جو چیزیں ان کے ذوق و مزاج یا عقیدہ و مذہب کے خلاف ہوئیں، انہیں اپنی حکمت عملی اور تدبر سے اپنے نہج کے موافق بنایا اور کسی دوسرے رنگ کی چھاپ اپنے اوپر نہیں پڑنے دی، اس میں دیر تو لگتی ہے مگر راستہ بہرحال نکل ہی آتا ہے، ع منزلیں ہیں ہر طرف راستہ نکالیے۔

سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں بڑی اتھل پتھل، ناہمواری، بے ترتیبی اور بے اصولی شامل ہوگئی ہے، ان کا کوئی لایحۂ عمل اور منصوبہ نہیں رہا، وہ بالغ نظری، سیاسی شعور اور دوراندیشی سے عاری ہیں، جوش و حمیت اور ہوش و تدبر دونوں کا اپنا مقام ہے، اس کا فرق اور اپنا سود و زیاں ان کو معلوم نہیں، اپنے کو متعدد گروہوں میں بانٹ رکھا ہے اور ہر شخص اور ہر گروہ کی نظر بس اپنے ہی مفاد تک محدود رہتی ہے، قومی و اجتماعی مفاد اور اس کے تقاضوں سے کوئی سروکار نہیں، اس سے بڑھ کر بدنصیبی یہ ہے کہ وہ ہر آواز لگانے والے کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں، جھوٹ، فریب، منافقت اور وعدہ شکنی ہمارے قومی لیڈروں کا شعار بن چکا ہے جس کا تجربہ ۴۷ء سے کیا جارہا ہے مگر مسلمان پھر بھی دھوکا کھا جاتے ہیں اور جس نے خوش آیند، دل فریب اور ان کے من کو بھانے والی بات کہی، اسی کو اپنا راہبر بنالیا اور جان و مال سب اس کے لیے نچھاور کردیا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جامعہ کراچی کا شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ ”جریدہ“ کے نام سے ایک معیاری اور بلند پایہ تحقیقی مجلہ نکال رہا ہے چند روز پہلے اس کا شمارہ ۳۰ آیا ہے، شروع کے شمارے نہیں ملے لیکن جو ملے ہیں ان کی حیثیت علمی، تحقیقی اور تاریخی دستاویز کی ہے، جریدہ کے اکثر مشمولات پہلے طبع ہوچکے ہیں مگر اب لوگوں کی دسترس سے باہر تھے، اس لیے اس قند مکرر کو جریدہ میں اہتمام اور سلیقے سے شایع کیا جاتا ہے، شمارہ ۲۱ تا ۲۶ و ۲۸ لسانیات، قدیم زبانوں، فلسفۂ لغت، وادی سندھ، اس کے قدیم رسم الخط، موہن جوداڑو کی مہروں، کتبات اور ہڑپہ اسکرپٹ وغیرہ سے متعلق بیش قیمت اور اہم مضامین پر مشتمل ہیں، دارالمصنفین کے مایہ ناز قدیم رفیق مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم کو ان مباحث پر

بڑا عبور تھا، معارف اور ماہ نو وغیرہ سے ان کے مضامین کو یکجا کر کے شایع کرنا اچھی علمی خدمت ہے، مولانا حسن مثنی ندوی کے رسالہ مہر نیم روز کراچی کے مستقل کالم "چہ دلاور است" کو شمارہ ۲۷ میں یکجا شایع کیا گیا ہے جس میں مصنفین کے سرقوں کا تذکرہ ہے، شمارہ ۲۵، ۲۶ اور ۲۸ کو متروکات کی لغت کا عنوان دیا ہے اور شمارہ ۲۹ و ۳۰ غیر مطبوعہ کتابیں نمبر ہے جو مجلد اور بہت ضخیم ہیں، ہر شمارے میں تنوع اور دل چسپی کے لیے دوسرے محققانہ مقالے بھی شامل رہتے ہیں، انگریزی حصہ بھی جان دار ہوتا ہے، اس محققانہ رسالے کی اشاعت کے لیے ہم جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور بالخصوص اس کے مرتبین جناب سید خالد جامعی ناظم اور جناب عمر حمید ہاشمی نایب ناظم کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

جامعہ کراچی ہی کی مجلس التفسیر نے بھی ایک مفید سہ ماہی دینی، علمی اور تحقیقی رسالہ "التفسیر" نکالا ہے، اس کا ابھی پہلا شمارہ طبع ہوا ہے جب یہ اپنے آغاز ہی میں اتنا ہونہار ہے تو آیندہ اس سے جو توقع بھی کی جائے وہ بے جا نہیں ہوگی، اس کے بھی اکثر مشمولات پہلے کے چھپے ہوئے ہیں لیکن لوگوں کے کمزور حافظے نے ان کو فراموش کر دیا تھا، اس لیے ان کو دوبارہ شایع کرنا علم و دین کی مفید خدمت ہے، انعامی بانڈز کے جواز و عدم جواز پر اہل علم و محققین کے خیالات نقل کر کے مدلل ترجیحی رائے پیش کی گئی ہے، مولانا شاہ محمد جعفر نے بتایا ہے کہ جہیز کتاب و سنت اور کتب فقہ سے ثابت نہیں، یہ قبیح رسم ہندوانہ اثر کا نتیجہ ہے، ایک مضمون میں اس کی تردید ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دوسروں کی بکریاں اجرت پر چرائیں، ایک مضمون میں چاروں ایمہ کے وہ مسایل درج ہیں جن میں شاہ ولی اللہ صاحب نے کسی ایک کی موافقت اور دوسروں کی مخالفت کی ہے، اسی طرح دوسرے مفید علمی و دینی موضوعات پر بھی پرمغز مضامین سے یہ شمارہ آراستہ ہے، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی درازی عمر کے لیے دعا کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مقالات

علامہ شبلی نعمانیؒ کے تعلیمی افکار

بلاد اسلامیہ اور ہندوستان کے پس منظر میں

از:- پروفیسر محمد راشد ندوی☆

علامہ شبلی نعمانی جس زمانے اور جس علاقے میں پیدا ہوئے اس وقت کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہ ہونہار فرزند کچھ عرصے کے بعد اپنے علاقے ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان اور سارے عالم اسلام کے لیے باعث افتخار اور ایک انمول موتی ہو جائے گا، علامہ شبلی کتنے ذہین تھے، ان کے اندر تلاش و جستجو کا کتنا مادہ تھا، ان کے قلم میں کتنی رعنائی و شگفتگی تھی، ان کے ذہن میں کتنی سنجیدگی اور اُپج تھی، اس کے بارے میں کسی نہ کسی طرح ان کے سیرت نگاروں نے اپنے مزاج و صلاحیت کے مطابق تبصرے کیے ہیں، خاص طور پر ان کے عزیز اور مقرب شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے بڑے عالمانہ اور محققانہ انداز میں سیر حاصل بحث کی ہے، مگر یہاں میں علامہ شبلی کے ان نظریات کے سلسلہ میں جو ان کے زمانہ میں موضوع بحث بنے ہوئے تھے کچھ عرض کروں گا، اس وقت ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں بھی تعلیم کے سلسلہ میں جدید و قدیم کی بحث چل رہی تھی اور ساری امت دونوں گروہوں کے بیچ سرگرداں و حیران تھی، اگر کسی مسئلے میں علمی اختلافات ہوتے ہیں تو اس فن کی ترقی ہوتی ہے اور اس فن کو سیکھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن اگر کسی مسئلے میں علمی بحث کی بجائے گروہ بندی اور تعصب کا شایبہ شامل ہو جائے تو اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو فایدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے، ۱۸۵۷ء

☆ سابق صدر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

کے بعد ہندوستان کا مسلمان سب سے زیادہ بدحالی، احساس کمتری اور شکست خوردگی کا شکار تھا اور اس کے دل میں روشن مستقبل کو بنانے کے بجائے حسرت و ماتم کے علاوہ کچھ نہ تھا، ان برے حالات میں مسلمانوں کے علاوہ جو قومیں یہاں تھیں وہ اپنے مستقبل کو بنانے کا مورچہ سنبھال رہی تھیں اور ترقی کی راہوں پر گامزن تھیں لیکن مسلمان انحطاط و تنزل کا بری طرح شکار تھا، اس بدحالی کے ماحول میں دیوبند کی تحریک اور بعد میں علی گڑھ تحریک وجود میں آئی، ان دونوں تحریکوں کے بانیوں نے اپنے اپنے طریقۂ کار کے مطابق کام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور دونوں کے مابین کسی قسم کی کشمکش کی فضا نہیں تھی، مولانا محمود الحسن دیوبندی اور سرسید احمد دونوں نے مختلف موقعوں پر اس بات کی وضاحت کی کہ دونوں اداروں کے درمیان کوئی نزاعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ دونوں کے الگ الگ مقاصد ہیں جن پر وہ چل رہے ہیں، علامہ شبلی علی گڑھ تحریک سے وابستہ ہوگئے، قبل اس کے کہ ہم علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات پر گفتگو کریں، مناسب ہوگا کہ اس پس منظر کا ذکر کریں جہاں علامہ شبلی پیدا ہوئے اور وہیں سے آفتاب بن کر چمکے۔

موصوف اعظم گڈہ کی ایک چھوٹی سی بستی بندول میں پیدا ہوئے، جس زمانہ میں وہ پیدا ہوئے، یہاں کا مسلمان دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا، یہ علاقہ سلطنت شرقیہ جون پور کے زیر اثر مدت دراز تک رہا اور جون پور کو جو علمی و ثقافتی مقام ان کے دور میں ملا وہ اس پورے علاقے کے لیے بھی نعمت ثابت ہوا، کیوں کہ پورے ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام کے اچھے اچھے علما جن کو اپنے اپنے فن میں اعلا درجہ کی مہارت حاصل تھی، یہاں جمع ہوگئے تھے، ان کی وجہ سے اس پورے علاقے میں بہار آگئی، ہر جگہ چمن کھلے ہوئے تھے جو رنگ برنگ پھولوں سے مچل رہے تھے لیکن بہار کے بعد جب خزاں آتی ہے تو سب کے دلوں میں حسرت و ماتم کے علاوہ کچھ نہیں بچتا اور ماضی کو یاد کر کے ہر ایک فرد مجسم رنج والم بن جاتا ہے، خزاں کے بعد کے دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس پر بہار زمانہ کی کچھ یادیں رہ جاتی ہیں اور وہ ان سے بہلتے رہتے ہیں، ان یادوں سے میری مراد وہ جاگیریں اور جایدادیں ہیں جو مختلف دوروں میں ان کے اسلاف کو حکومت کی طرف سے عطیے کے طور پر ملی تھیں، یہ عطیے کبھی کسی عالم کی علمی خدمت، کبھی کسی صوفی کی وجاہت و شہرت، کبھی کسی اعلا درجہ کے حاکم و ملازم جن میں قاضی، فوج کے سپہ سالار، مختلف وزارتوں کے حکام

الغرض یہ انعامات مختلف طریقہ کے لوگوں کو ملتے رہے جو ان کی تسلی کے لیے اور ان کے اچھے وقت کو گزارنے کے لیے کافی تھے، اس طرح شیراز ہند کا یہ علاقہ دو حصوں میں بٹا، بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمین داروں دوسرے ان چھوٹے چھوٹے زمین داروں اور کاشت کاروں کا جن کی اس علاقہ میں اکثریت تھی جن کا ذریعہ معاش ان کی چھوٹی چھوٹی جایدادیں اور چھوٹی موٹی تجارتیں تھیں لیکن ان دونوں طبقوں کی معاشرت اور رہن سہن میں زمین و آسمان کا فرق تھا، زمین داروں اور جاگیرداروں جن کے ہاتھ سے حکومت نکل چکی تھی ان کے یہاں ہر طرح کی خوش حالی اور دولت کی فراوانی تھی، وہ بہت ہی سکون اور اطمینان کے ساتھ اعلا درجہ کی زندگی بسر کر رہے تھے، یقیناً دولت کی فراوانی و خوش حالی سے ان کے یہاں تعلیم بھی تھی اور اعلا درجہ کی معاشرتی زندگی بھی تھی یعنی ان کے لڑکوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق ہوتا تو ان کی تعلیم کے لیے اچھے اساتذہ بھی مہیا کیے جاتے تھے اور ہندوستان کے کسی علاقہ میں کوئی علمی ادارہ یا درس گاہ ہوتی تو بڑی آسانی سے ان کو وہاں بھیجا جا سکتا تھا جہاں وہ اعلا درجہ کی تعلیم حاصل کر کے ہندوستانی سوسایٹی میں اعلا مقام حاصل کرتے تھے اور حکومت کے اعلا عہدوں کے لیے بھی گنجایش رہتی تھی، ان میں کچھ ایسے علما بھی پیدا ہوئے جو ملازمت کے بجائے بہت خاموشی سے اپنے علمی کاموں میں لگے رہے اور تصنیف و تالیف کا اچھا ذخیرہ انہوں نے چھوڑا، ان کی بہت بڑی تعداد ہے، علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ کی سیرت حیات شبلی میں بہت تفصیل سے اس علاقہ کے علما و فضلا پر بحث کی ہے اور بڑی محنت و جاں فشانی سے اعلا درجہ کا مواد فراہم کر دیا ہے، اس لیے اس پر کوئی اضافہ کرنا ممکن نہیں، دوسرا طبقہ چھوٹے زمین داروں، کاشت کاروں اور اوسط درجہ کے تاجروں پر مشتمل تھا، یہ طبقہ زیادہ تر گاؤں اور چھوٹے قصبات میں رہتا تھا، جہاں نہ تعلیم کا کوئی نظم تھا اور نہ نقل و حرکت کے ذرائع میسر تھے، اس لیے ان علاقوں کے رہنے والوں کو نہ یہ خبر تھی کہ ہم کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں، دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے اور کون سے اہم مسائل ہیں جن سے ہماری قوم دوچار ہے، علامہ شبلی کا تعلق تقریباً ایسے ہی طبقے سے تھا، ان کے والد اوسط درجہ کے زمین دار تھے، زمین داری کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتے تھے، اس زمانہ میں تیل کی تجارت کا عام رواج تھا، اس طرح گاؤں کے عام لوگوں کے مقابلہ میں ان کی زندگی خوش حال تھی، خوش حالی کے ساتھ اپنے علاقہ میں ان

کا بڑا رعب و دبدبہ تھا، اس طرح علامہ شبلی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی نہ تو ان کے یہاں دولت کی غیر معمولی فراوانی تھی اور نہ تنگی و بدحالی، بلکہ ایک پرسکون زندگی گزار رہے تھے اور اس ماحول کے نتیجے میں ان کے اندر حمیت وغیرت اور عزت نفس پیدا ہوئی اور جس کی یہ دولت وہ زندگی کے ہر مرحلے میں اپنے سر کو اونچا ہی رکھنے کی کوشش کرتے رہے، ان کے والد اپنے بچوں کے لیے جو بھی اس زمانہ میں تعلیم کا رواج تھا، بڑی آسانی سے انتظام کرسکتے تھے بلکہ جہاں بھی چاہتے، اعلا تعلیم کے لیے بھیج سکتے تھے، علامہ کی ابتدائی دینی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد اپنے ذوق وشوق کے مطابق اس دور کے مشہور اساتذہ سے فیض یاب ہوتے رہے، کبھی مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور کبھی مولانا احمد علی سہارن پوری سے استفادہ کرتے رہے، یہ ہندوستان کی وہ ہستیاں ہیں جو اپنے دور میں اپنی ذات سے انجمن کی حیثیت رکھتی تھیں، جو بھی وہاں جاتا علم وادب کی دولت سے مالا مال ہوجاتا، علامہ شبلی کو اللہ نے عجیب وغریب ذہن عطا کیا تھا، وہ اپنے اساتذہ کے علم و عرفان کی دولت سے بہت جلد مالا مال ہوجاتے، اس طرح اس دولت کو اپنے حلقہ سے وابستہ لوگوں میں بھی منتقل کرتے، علم کو اخذ کرنا تو بڑی حد تک آسان ہے لیکن اس کو دوسروں تک منتقل کرنے کی صلاحیت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، اللہ نے علامہ شبلی کے ہاتھ میں عجیب وغریب شمع عطا کی تھی، جب چاہتے اس کو اپنے ہاتھ میں رکھتے اور جب چاہتے دوسروں کے ہاتھ میں دے دیتے، گویا وہ شمع متحرک تھی، علامہ شبلی کی کسی اسکول یا مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ علم کے پروانے تھے جہاں بھی علم کی شمع روشن دیکھتے اس پر نثار ہوجاتے، علم وعرفان سے مالا مال ہونے کی بے تابی اور بے چینی ان کی زندگی کے ہر مرحلہ میں تھی اور آخری زندگی تک برقرار رہی، اگر ان کے ایک ہاتھ میں علم کی شمع ہوتی تو دوسرا ہاتھ ایک اور شمع کے لیے آگے بڑھتا اور بے تابی سے بڑھتا، یہی ان کا خاص امتیاز ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے علما وادبا سے منفرد ہیں، ان کا یہی علمی شوق اور جنون اس دور کے مشہور اساتذہ سے فیض یاب ہونے کے بعد ان کو علی گڑھ لے گیا، جہاں نہ معلوم کتنے علم کے شیدائی تھے اور کتنی شمعیں وہاں روشن تھیں، ان کی نظر کو کیسی روشنی ملی اور ان کی علمی پیاس بجھانے کے لیے کون سا شیریں اور ٹھنڈا چشمہ مل گیا، جہاں علامہ شبلی کی بے چین روح کو سکون واطمینان نصیب ہوا، پڑھنے، پڑھانے، سیکھنے اور سکھانے، اپنے ادبی وشعری ذوق

کو بڑھانے اور پروان چڑھانے کا خوب موقع ملا۔

علامہ شبلی کی دنیا علی گڑھ آنے سے پہلے محدود تھی، اب لامحدود ہوگئی، وہ اعظم گڈھ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مسائل پر غور وخوض کرنے لگے، وہ مسائل چاہے سیاسی ہوں یا ثقافتی، مذہبی ہوں یا اجتماعی اور کچھ عرصہ کے بعد ان کی بے چین وبے تاب روح عالم اسلام کے ہر سیاسی وعلمی مسائل سے جا ملی، ایسا لگتا ہے کہ رواں دواں دریا چھوٹے چھوٹے دریاؤں کو اپنے دامن میں سموتے ہوئے سمندر سے جا ملا، علی گڑھ علم وعرفان اور زبان وبیان کا گہوارہ بن گیا، جہاں علم و عرفاں کی ہمہ جہتی تھی، علامہ شبلی علی گڑھ میں عربی وفارسی کے استاذ مقرر ہوئے، ان کو دونوں زبانوں میں اعلا درجہ کا کمال حاصل تھا، ان کی نظر ذہین وباصلاحیت لڑکوں پر رہتی جن کو وہ اپنے حلقے میں شامل کرتے اور کچھ عرصہ کے بعد ان کو ماہر وباکمال بنادیتے، علی گڑھ تحریک کے بانی اور روح رواں سرسید تھے، انہیں کے ذوق اور منصوبے کے تحت دار العلوم چل رہا تھا، سرسید اس نئے دار العلوم کو دنیا کی ترقی یافتہ اور منظم یونی ورسٹی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے، اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لیے جو بھی وسائل وذرائع ہوسکتے تھے، ان کو وہ اپنی اور اپنی قوم کی بساط کے مطابق مہیا کررہے تھے، ایک طرف قوم کو اس ادارہ سے انتہائی نفرت وعداوت تھی تو دوسری طرف ایک بڑی تعداد اس کو مسلمانوں کو ذلت وپستی سے نکالنے کے لیے سفینۂ نوح تصور کرتی تھی اور یہ ادارہ مخالفت اور دشواریوں کے باوجود اپنی منزل کو بڑی تیزی سے طے کررہا تھا جس کا تعلیمی خاکہ مغرب کی جامعات کے طرز پر بنایا گیا تھا جس کے لیے انہیں یوروپ جاکر وہاں کی مختلف یونی ورسٹیوں کے نظام تعلیم اور رہائشی نظم ونسق کو دیکھنا پڑا، سرسید کو اس ادارہ کو صرف تعلیمی حدود تک محدود نہیں رکھنا تھا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن سے مربوط بھی کرنا تھا، اس ادارہ کو مسلمانوں کے مسائل سے اور مسلمانوں کو اس کے مسائل سے پوری دل چسپی ہو اور دونوں میں باہم تال میل ہو، یہ تھی سرسید کی سوچ جو بالکل نئی تھی، جس نے اس ادارہ کو دوسرے اداروں سے ممتاز و منفرد کردیا تھا، گویا یہ ادارہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی وثقافتی رہنمائی بھی کرے اور یہاں کے مسلمانوں کو اس سے والہانہ لگاؤ بھی پیدا ہو، سرسید کو اپنے منصوبہ میں پوری کامیابی ہوئی، اس کامیابی میں ان کے دوسرے شرکا ورفقا کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے، ان کے تعاون اور کوششوں سے اس

ادارہ کو عالمی شہرت حاصل ہوئی، علامہ شبلی اس ادارہ میں صرف استاذ ہی نہیں تھے اور نہ ان کی ذہنی پرواز اس پر قانع ہوسکتی تھی بلکہ وہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے لیے بھی کافی متفکر رہتے تھے، ہر چند کہ ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمان اور غیر مسلم اس ادارہ میں تعلیم حاصل کررہے تھے اور ہندوستان کے سماج میں اپنا مقام بنا رہے تھے لیکن اس ادارہ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کا تعلق اعلا درجہ کے طبقے سے تھا، غریب یا اوسط درجہ کے طبقہ کے طلبا کی تعداد بہت کم تھی، نہ تو وہ مصارف برداشت کرسکتے تھے اور نہ اونچے طبقہ کے طلبا کے معیار کے مطابق اس ادارہ میں رہ سکتے تھے، چنانچہ علامہ شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کو نئے زاویہ سے سوچنا اور غور کرنا شروع کیا، جدید طرز کی تعلیم گاہوں کی تعداد ہندوستان میں اچھی خاصی تھی اور ان میں بھی صرف خوش حال خاندانوں کے بچوں کی رسائی ہوسکتی تھی لیکن ملک کی ایک بڑی تعداد ان اداروں تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی، خاص طور سے مسلمان جو ہندوستان کے ہر علاقہ میں سب سے زیادہ مفلس اور بدحال تھا، جدید تعلیمی اداروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قایم کردہ دینی اور مذہبی ادارے اور مدارس تھے جن کا پورے ہندوستان میں جال بچھا ہوا تھا، جہاں ہر طرح کے مسلمان بچوں کی رسائی تھی اور وہاں ان کے لکھنے پڑھنے کی تمام آسانیاں فراہم کی جاتی تھیں، ان کا نظام تعلیم بالکل قدیم تھا، جن کا نئے تعلیمی اداروں سے کہیں سے بھی تال میل نہیں تھا، اس طرح جدید وقدیم اداروں اور درس گاہوں کے درمیان نہ تو کشمکش تھی اور نہ ٹکراؤ، کیوں کہ ٹکراؤ اور کشمکش اس وقت ہوتی ہے جب دونوں طرف کے اداروں میں مماثلت یا برابری ہو، دونوں کے نظام تعلیم اور بچوں کے رہن سہن اور سوچنے سمجھنے کے انداز بالکل مختلف تھے، علی گڑھ تحریک سے علامہ شبلی کو صرف اتفاق ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس کے فعال کارکن بھی تھے، اسی کے ساتھ ان کو ہندوستان کے عام مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی بھی فکر تھی، ان کے سامنے وہ دینی مدارس ومکاتب تھے جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کا نظام تعلیم ایسا تھا جو مسلمانوں کی ضروریات کو کس حد تک پورا نہیں کرسکتا تھا، کیوں کہ دنیا میں ہمیشہ تعلیمی نظام اور اس کا ڈھانچہ وقت کی ضروریات کے مطابق بنایا جاتا ہے، گویا ہر تعلیمی نظام کو متحرک اور فعال ہونا چاہیے، اگر وہ فعال ومتحرک نہیں ہے تو اس کے تعلیم یافتہ اپنے سماج کو فایدہ پہنچانے کے بجائے اس پر بوجھ بن

جاتے ہیں، علامہ شبلی کو یہ فکر ہمیشہ دامن گیر رہی، سرسید احمد خاں نے یورپ کا سفر وہاں کی جامعات کے تعلیمی اور اقامتی نظام کو دیکھنے کی غرض سے کیا تھا تاکہ دارالعلوم کو بہتر سے بہتر بنا سکیں اور اس کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ قوم وملت کے لیے نمونہ بن سکیں، کسی جامعہ کی شہرت اور اس کی نیک نامی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک اس میں باکمال اساتذہ کا تقرر نہ ہو اور اس کا اقامتی نظام ہر اعتبار سے مناسب حال نہ ہو، علامہ شبلی علی گڑھ میں استاذ تھے، اس ادارہ سے ان کو محبت تھی، اس کی خوبیوں اور خامیوں سے وہ پوری طرح واقف تھے، اسی طرح ان کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ وہ اسلامی ملکوں کا سفر کریں اور قریب سے وہاں کے سیاسی، دینی اور تعلیمی حالات کا مشاہدہ کریں، چنانچہ انہوں نے مصر وشام اور ترکی کے سفر کا ارادہ کیا اور اللہ کی مدد سے ان کی یہ خواہش پوری ہوئی، ان ملکوں کے قدیم وجدید نظام تعلیم کی روشنی میں ہندوستان کے نظام تعلیم میں اچھی اور مناسب ترمیم کرسکتے تھے جو سب کے لیے قابل قبول ہو، سب سے پہلے وہ ترکی گئے، اس علاقہ سے ان کو محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا، وہاں کے ذرہ ذرہ کو آنکھوں سے لگالیتے، علامہ شبلی نے وہاں کے جدید وقدیم دونوں طرز کے اداروں کو دیکھا، جدید طرز کے اداروں کو دیکھ کر ان کا دل مچل اٹھا اور ان کی آنکھیں چمک گئیں، اس سلسلہ میں انہوں نے المکتبۃ الحربیۃ (ڈیفنس کالج)، المکتبۃ الملکیۃ (سول سروس کالج) کا دورہ کیا اور ہر چیز کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی، جو چیز ان کو پسند آتی اس پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے اور منتظمین کو خراج تحسین پیش کرتے، یہاں ڈیفنس کالج کے سلسلے میں ان کے تاثرات ملاحظہ کیجیے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنا حساس دل اور کتنی بصیرت عطا فرمائی تھی:

> ”حقیقت یہ ہے کہ وسعت عمارت، فراہمی آلات، علمی وسعت، تعلیم اور خوبیٔ انتظام کے لحاظ سے تمام قسطنطنیہ میں اس سے عمدہ کوئی کالج نہیں ہے، البتہ یہ افسوس ہے کہ اس کے اعلا کلاسوں میں تعلیم پانے والے زیادہ تر عیسائی ہیں، مسلمانوں کی تعداد کم ہے، شیخ عبدالفتاح آفندی نے مجھ کو سال رواں کی رپورٹ نتیجۂ امتحان عنایت کی تھی، اس میں جس قدر اعلا درجہ کے امتحانات پاس کرنے والے ہیں اکثر عیسائی ہیں، مجھ کو خدانخواستہ عیسائیوں کی ترقی پر حسد نہیں

ہے لیکن مسلمانوں کے تنزل کا رنج ضرور ہے'' (۱)۔

اس کے بعد سول سروس کالج کا معاینہ کرتے ہوئے ہاسٹل بھی گئے، جہاں کے ڈائننگ ہال کا بڑے غور سے جائزہ لیا، لکھتے ہیں:

''منیجر صاحب نے مجھ کو کالج کے تمام کمروں کی سیر کرائی، کھانے کا کمرہ نہایت سلیقگی سے مرتب تھا، میز پر نہایت صاف چادر بچھی تھی، کھانے کے پرتکلف برتن خوبصورتی کے ساتھ چنے تھے، صراحیاں جو طالب علموں کی تعداد کے موافق تھیں، عموماً شیشے کی تھیں اور گویا میز کی آرایش کا کام دیتی تھیں، کیمسٹری وغیرہ کی تعلیم کے کمرہ میں اعلا درجہ کے آلات تھے اور کثرت سے تھے، اسی سلسلۂ عمارت میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، اس کی عمارت چنداں قابل ذکر نہیں لیکن چوں کہ اندر باہر اعلا درجہ کا ترکی قالین بچھا ہوا تھا، خوبصورت اور مزین معلوم ہوتی تھی، ایک طرف دیوار پر خط نسخ میں ایک عمدہ قطعہ آویزاں تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، نہایت عمدہ خط ہے، اسی اثنا میں ظہر کا وقت آگیا، مسلمان لڑکوں نے (عیسائی طالب علم بھی یہاں کچھ کم نہیں ہیں) نماز کی تیاری کی، وہ عموماً کوٹ، پتلون پہنے ہوئے تھے اور اس لباس میں ان کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا اور وقار و احترام کے ساتھ قطار در قطار مسجد کو جانا میرے دل پر عجیب اثر پیدا کرتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزلی ہزار درجہ بہتر ہے، نماز کے بعد تھوڑی دیر تک وعظ بھی ہوتا رہا لیکن بہت کم اس میں شریک تھے'' (۲)۔

علامہ شبلی نے ترکی میں جو جدید تعلیم گاہوں کو دیکھا تو ان کا دل باغ باغ ہوگیا، اگرچہ جو بھی وہاں جدید تعلیم ہے، وہ درحقیقت مغربی تعلیم کا نقش اور تقلید ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مشرق میں جو بھی جدید تعلیم کا رواج ہوگا، اس میں کسی اعتبار سے نیاپن نہیں ہوگا لیکن پھر بھی یہ ترقی کی علامت

(۱) سفرنامہ روم و مصر و شام، ص ۶۷، جدید اڈیشن، ص ۶۴۔ (۲) ایضاً، ص ۷۶، جدید اڈیشن، ص ۶۶۔

ہے، اگر اس کو سلیقہ اور سنجیدگی سے اپنایا جائے تو آگے کی تمام منزلیں آسان ہو جائیں گی، کیوں کہ سائنس ٹکنالوجی کے جو بھی جدید اصول اپنائے جائیں گے، وہی ہوں گے جو مغرب میں صدیوں سے رائج ہیں، جن کی بنیاد پر اس نے علم و فن کی اعلا منزلیں طے کی ہیں اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی ممالک کے تمام ماہرین تعلیم کی سب سے بڑی کامیابی اس میں ہوگی کہ وہ مغربی تعلیم و ثقافت کے اصول و ضوابط کو زیادہ سے زیادہ سمجھ لیں اور اپنے اپنے ملکوں میں اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں، خاص طور سے ہندوستان اور اسلامی ممالک قابل ذکر ہیں، کیوں کہ ان میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں کے ماہرین تعلیم نے اپنے ملک کے قومی و سیاسی ڈھانچہ کو مدنظر رکھ کر اپنے یہاں کے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا ہو، کیوں کہ بڑے سے بڑے ماہر تعلیم کی نظر اور پرواز مغربی تعلیم و ثقافت ہی ہے اور وہ اس کے دائرہ میں رہ کر سوچتا ہے اور کوئی راہ متعین کرتا ہے، کیوں کہ ان ملکوں کے تعلیمی ادارے چاہے وہ ہندوستان ہو یا دوسرے ممالک کی درس گاہیں بے جان و بے مقصد ہیں، جہاں پڑھنے اور پڑھانے والوں دونوں کو اپنی منزل کی خبر نہیں، علامہ شبلی نے جدید تعلیم گاہوں کو دیکھ کر اپنی مسرت و اطمینان کا اظہار کیا ہے، اب قدیم درس گاہوں سے متعلق ان کے تاثرات کو دیکھیے:

''جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ترکوں میں تعلیم کا آغاز سلطنت کے ساتھ ساتھ ہوا ہے، یہ وہی تعلیم تھی جس کو ہم آج قدیم تعلیم کے نام سے یاد کرتے ہیں، بے شبہ وہ کسی زمانہ میں اعلا درجہ پر تھی، چنانچہ افضل الدین خونجی، علامہ قوشجی، چلپی، خواجہ زادہ، حاجی خلیفہ وغیرہ کی تصنیفات آج تک اس کی یادگار ہیں لیکن موجودہ تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اس قدیم تعلیم کی ابتری تھی، یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور تعلیم قدیم کی ابتری پر رنج و افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسرے قسم کا افسوس تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر رنج و افسوس ظاہر کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ رنج نہیں بلکہ استہزا و شماتت ہے، میں اگرچہ نئی

تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قایم رہنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری ہے اور سخت ضروری ہے، اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقہ پر حاوی ہے وہ بالکل بے اصول اور بے معنی ہے تو خواہ مخواہ نہایت رنج ہوتا ہے، ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا ہے کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں نہ ہو، اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے لیکن قسطنطنیہ، شام، مصر میں یہی حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا ہے" (۱)۔

ترکی کے بعد مولانا کا علمی کارواں شام و فلسطین پہنچا، شام و فلسطین میں تعلیم و ثقافت کی صورت حال دیکھ کر مولانا کا دردمند دل بے تاب ہوگیا، یہ وہ علاقہ ہے جہاں ماضی میں علم و عرفان کے سوتے ابلتے تھے، زبان و بیان کی شمعیں ہر خطہ میں روشن تھیں، جہاں ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن عساکر، جیسے مفکر و مصنف پیدا ہوئے، متنبی، ابوتمام، بحتری اور ابوالعلا المعری جیسے شاعر پیدا ہوئے، آج پورے علاقہ میں کوئی بھی سرکاری یا قومی ادارہ موجود نہیں جس کو دیکھ کر آنکھ کو ٹھنڈک اور دل کو راحت محسوس ہو، شام کے ساحلی علاقہ (موجودہ لبنان) میں کچھ اعلا پیمانہ کے اسکول اور کالج نظر آئے، خاص طور سے بیروت میں امریکن یونی ورسٹی جس کو مولانا نے بڑے غور سے دیکھا اور ان کے قایم کرنے والوں اور موجودہ منتظمین کی اعلا صلاحیتوں کی دل کھول کر داد دی لیکن اخیر میں بڑی حسرت سے یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ان اداروں اور کالجوں کو بڑھانے اور اس مقام تک پہنچانے میں حکومت اور یہاں کے عوام کا بھی کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ غیر ملکی سرمایہ اور غیر ملکی ذہن و فکر کی دین ہے جو اپنے خاص مقاصد کے تحت اس علاقہ میں جدید تعلیم کو رواج دینا چاہتی ہے، افسوس اس بات کا ہے کہ سرزمین فلسطین میں کوئی ادارہ نظر نہیں آیا جس کو اس زمانہ میں ادارہ کہا جاسکے، یہ حکومت اور عوام کی بے حسی بلکہ جہالت اور مفلسی کی علامت ہے۔

شام و فلسطین کے بعد مولانا مصر کی علمی و ادبی زندگی دیکھنے کے لیے بے تاب و بے چین تھے، کیوں کہ ان کی نظر میں مصر ہی عالم اسلام کا سب سے بڑا علمی و ثقافتی مرکز ہے، بلاد عربیہ بلکہ

(۱)(۱) سفرنامہ روم و مصر و شام ص ۷۷-۷۸، جدید ایڈیشن ص ۶۷۔

بلاد اسلامیہ جہاں جہاں علم و عرفان کی کرنیں ہیں، وہ یہیں سے نمودار ہوتی ہیں، مصر پہنچ کر سب سے پہلے انہیں جامعہ ازہر دیکھنے کی دھن تھی جو عالم اسلام کی سب سے پرانی یونی ورسٹی ہے لیکن جامعہ ازہر کا حال دیکھ کر مولانا کا دل بیٹھ گیا، کیوں کہ یہ صرف روایتی ادارہ بن کر رہ گیا ہے، نہ اس میں تعلیم کا انتظام ہے نہ لڑکوں کے رہنے کا معقول نظم، لڑکوں کے رہنے کے لیے جو ہاسٹل ہیں ان کو رواق کہا جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ ویران خانقاہوں کے مجاور ہیں جو ازہر کے وظیفہ پر پلتے ہیں جو روٹیاں انہیں دونوں وقت دی جاتی ہیں انہیں وہ دوکانوں پر بیچ دیا کرتے ہیں، ان طالب علموں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے گھر کی مالی حالت اچھی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی قوم ذہنی پستی کا شکار ہوتی ہے تو اس کے لیے حقیر سے حقیر کام روا ہو جاتا ہے، ایسے طلبا جب دینی تعلیم حاصل کر کے عوام میں تعلیم و تدریس اور تبلیغ و تربیت کے منصب پر فائز ہوں گے تو عوام پر ان کا کیا اثر ہوگا، عوام کے لیے مفید ہونے کے بجائے ان پر بوجھ بن جائیں گے، ازہر کے تعلیمی نظام کا جائزہ لینے کے بعد مولانا نے مصر کے سرکاری اداروں، اسکولوں اور کالجوں کا جائزہ لیا جن میں لا کالج، انجینیرنگ کالج، لسانیات کا کالج اور میڈیکل کالج وغیرہ شامل ہیں، مولانا کی نظر میں یہ ادارے مغربی طرز پر قایم کیے گئے ہیں، ان کے نصاب، انتظام و انصرام بالکل مغربی طرز کے ہوتے ہیں، پڑھانے والے اساتذہ کی اعلا تعلیم مغرب کی اعلا یونی ورسٹیوں میں ہوتی ہے، اس طرح کے اسکول و کالج ہندوستان میں بھی ہیں، مثلاً الہ آباد یونی ورسٹی، کلکتہ یونی ورسٹی، مدراس یونی ورسٹی اور حال میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (۱)، ان کو دیکھ کر مولانا بہت زیادہ متاثر نہیں ہوئے، کیوں کہ مولانا کا خیال ہے کہ اس طرح کے اداروں کا وجود حالات کے لحاظ سے ہوتا ہی رہتا ہے اور یقیناً یہ خوش حالی اور روشن خیالی کی علامت ہے اور اس کے بغیر کوئی ملک زندہ نہیں رہ سکتا، علامہ شبلی کا عالمانہ ذہن اور عاشقانہ دل کسی اور ہی آستانہ کا متلاشی تھا جہاں زبان و بیان اور علم و عرفان میں قدیم و جدید کی مہک نظر آتی ہو، جہاں طالب علم اپنے ماضی کا عظیم الشان سرمایہ اور حال کی بڑھتی ہوئی ترقی سے اپنے دامن کو مالا مال کر سکے، یہ مہک ان کو قاہرہ کے ایک کالج کلیہ دارالعلوم میں نظر آئی، مولانا اس کے بارے میں خاص انداز میں ذکر فرماتے ہیں:

(۱) اس وقت علی گڑھ کالج تھا، یونی ورسٹی بعد میں ہوئی۔

''مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے دور کے لیے کافی سمجھا یہ وہی کالج ہے، میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قایم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی، بے شبہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی، جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے، یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے، صرف یہ دارالعلوم ہے جو دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی پوری کامیاب نہیں ہوا ہے، اس کالج (۱) کا اول جس کو خیال ہوگا وہ علی پاشا مبارک مصر کا ایک مشہور روشن ضمیر ہے، اس نے خود مشرقی اور مغربی تعلیم دونوں حاصل کی ہے اور یورپ کی متعدد زبانیں جانتا ہے اور کئی مرتبہ مصر کے سررشتۂ تعلیم کا افسر رہ چکا ہے، اس کی تاریخی تصنیفات تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور درحقیقت نہایت مفید ہیں، اس نے جامع ازہر کی طرز تعلیم کی بھی اصلاح کرنی چاہی تھی لیکن ازہر کے شیوخ راضی نہیں ہوئے، غالباً اسی کے بعد اس نے اس کالج کی بنیاد ڈالی......'' (۲)۔

کلیہ دارالعلوم کی زیارت اور اس کا تنقیدی جایزہ لینے کے بعد مولانا جامع ازہر تشریف لے گئے، یہ وہ یونی ورسٹی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی سب سے پرانی یونی ورسٹی ہے

(۱) یہ کالج اب قاہرہ مصر کا اہم کالج بن گیا ہے اور قاہرہ یونی ورسٹی سے اس کا الحاق ہوگیا ہے اور اس کالج سے بڑے بڑے ادیب محقق، مصنف اور ماہر تعلیم پیدا ہوئے، اس کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور اسلامی علوم و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ (۲) سفرنامہ روم و مصر و شام، ص ۱۸۶-۱۸۷، نیا اڈیشن، ص ۱۶۰-۱۶۱۔

اور شاید دنیا کے کسی خطہ کے پڑھے لکھے مسلمان نے اس یونی ورسٹی کا نام نہ سنا ہو بلکہ مذہبی تعلیم یافتہ طبقہ میں اس یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنا بہت بڑی معراج تصور کی جاتی ہے لیکن گردش ایام کو کیا کہیے کہ وہ کسی چیز کو اپنی حالت پر قایم نہیں رہنے دیتی، بڑی بڑی عمارتیں، شاندار محلات اعلا درجہ کی جامعات اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور انسان وہاں حیران و ششدر ہو کر زبان حال سے یہ کہنے لگتا ہے کہ ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''، آیئے ہم علامہ شبلی کے ساتھ اس ادارہ کی سیر کریں اور ان کے تاثرات و مشاہدات سے محظوظ ہوں:

''یہاں کی قدیم تعلیم دوسرے لفظوں میں جامعہ ازہر کی تعلیم ہے، اس کی قدیم تعلیم کی کیفیت بیان کرنے کے لیے جامعہ ازہر کے حالات بیان کرنے کافی ہیں، یہ وہی جامعہ ازہر ہے کہ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں اس سے قدیم کوئی یونی ورسٹی نہیں، یہ ایک جامع مسجد ہے اور قاہرہ میں جو سب سے پہلی مسجد تعمیر ہوئی وہ یہی ہے، فاطمیین مصر میں سے خلیفہ المعزلدین اللہ کے ایک غلام جو سسلی کا رہنے والا تھا وہ اپنی قابلیت خداداد سے دولت فاطمیہ کا دست و بازو بن گیا، نے ۳۵۹ھ میں اس مسجد کی بنیاد ڈالی اور ۳۶۱ھ میں انجام کو پہنچی، ۳۷۸ھ میں خلیفہ المعزلدین اللہ نے مسجد سے متصل طالب علموں کے لیے کچھ مکانات بنوائے اور ۳۵ طالب علموں کے لیے وظیفہ مقرر کیا، حاکم بامر اللہ نے ۴۰۰ھ میں مسجد کی تعمیر میں تجدید کی، اور اس کے مصارف کے لیے ۱۶۷- دینار سالانہ منافع کی جایداد وقف کی اور ۶۱۷ھ میں امیر طورش نے یتیموں کے لیے ایک خاص مکتب قایم کیا اور اس کے ساتھ عام طلبائے مسجد کے لیے بہت سی جایدادیں وقف کیں، رفتہ رفتہ بہت بڑا دارالعلوم بن گیا، یہاں تک کہ ۸۱۸ھ میں اس کے طالب علموں کی تعداد ۷۰۰ سے متجاوز تھی جس میں ہر ملک اور ہر قوم کے اشخاص تھے اور آج تو یہ حالت ہے کہ کثرت طلبہ کے لحاظ سے تمام دنیا کی کوئی یونی ورسٹی اس کی ہمسری نہیں کر سکتی'' (۱)۔

(۱) سفرنامہ روم و مصر و شام، ص ۲۰۰-۲۰۱، جدید اڈیشن، ص ۱۷۲-۱۷۳

اس کے بعد علامہ موجودہ تعلیم اور اقامتی صورت حال دردبھرے انداز میں یوں ذکر کرتے ہیں:

''مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامعہ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا، کسی چیز سے نہیں ہوا، ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر خطہ کے مسلمان جمع ہوں، جس کا سالانہ خرچ دوتین لاکھ دینار سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم وتربیت سے کیا کچھ امید نہیں کی جاسکتی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فایدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کرچکا ہے اور کرتا جاتا ہے، تربیت اور معاشرت کا جوطریقہ ہے جس کا ذکر میں کرچکا ہوں، اس کے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش وہمت، غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہوجاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں جن کے عزیز اور نہایت قریب چچا، ماموں وغیرہ اس شہر میں بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چوں کہ یہ طلبہ ازہر میں رہتے ہیں، اس لیے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرہ بھر شرم نہیں آتی، طالب علموں کی دنائت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسہ کی ترکاری خریدتے ہیں تو کجڑے کو قسم دلاتے ہیں کہ تم پر سیدنا امام حسینؓ یعنی تجھ کو امام حسینؓ کے سر کی قسم واجب قیمت بتانا، کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے امید ہوسکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت اور شان کو بڑھائیں، ہمارے ملک میں جو مدرسے ہیں ازہر ان سے بھی گیا گزرا ہے، اس سے زیادہ افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے، یہاں مستقل اور اصل طور پر صرف فقہ اور نحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لیے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں، منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب اور معانی وبیان کی تعلیم ہے، لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلوم کے کسی طرح شایان شان نہیں، نحو اور فقہ جس پر ایک عمر صرف کی جاتی ہے، ان کی تعلیم بھی محققانہ اور مجتہدانہ نہیں

ہوتی، کافیہ وغیرہ کی شرحیں، شرحوں کے حواشی اور حواشی کے حواشی پڑھائے جاتے ہیں، شیخ طبان حال میں ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کی ایک شرح ہے، اس شرح کو اس قدر مہتم بالشان سمجھا گیا کہ اس کی شرحیں اور شرحوں کے حاشیے درس میں داخل ہیں اور اس تمام سلسلہ کا ضبط وحفظ کرنا بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، چوں کہ خود ازہر میں قیام تھا اور اکثر طلبہ سے صحبت رہتی تھی لیکن میں ان کو نہایت معمولی، ناقابل التفات، جزئی بحثوں میں مصروف دیکھتا تھا اور افسوس کرتا تھا، اسی لغو طریقہ تعلیم کا اثر ہے کہ ایک مدت سے ازہر نے کوئی قابل قدر عالم اور مصنف نہیں پیدا کیا، میں نے طلبہ سے دریافت کیا کہ شیخ ازہر جو استاذالکل خیال کیے جاتے ہیں ان کی کوئی تصنیف بھی ہے، انہوں نے بڑے فخر سے کہا، کہ ہاں، صبان پر بڑے معرکے کے حاشیے لکھے ہیں''(۱)۔

آگے چل کر مولانا ازہر کے نظام تعلیم اور اعلا تعلیم کی منصوبہ بندی کا ذکر فرماتے ہیں، مولانا کی اگرچہ کسی جامعہ یا مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی تھی لیکن جامعات میں علوم شرقیہ اور عربی زبان وادب کے پڑھنے اور پڑھانے کے جوبھی اصول وطریقے رائج تھے جن میں مغربی اساتذہ اور محققین کا زیادہ دخل ہے، کیوں کہ جدید طریقے بنانے کے اصول یا ریسرچ وتحقیق کے جو ضوابط پائے جاتے ہیں، وہ مغربی اساتذہ کی دین ہیں، علامہ شبلی علی گڑھ کے دوران ملازمت مختلف درجات کے نصاب تعلیم کی تعلیم کے علاوہ یونی ورسٹی کے ذہین اور ہونہار بچوں کے لیے الگ سے بھی وقت نکال کر ان کی ذہن سازی اور تربیت میں لگے رہے، گویا ذہین اور باذوق استاذ کے سامنے تعلیم وتدریس اور تحقیق وتصنیف کی نئی نئی راہیں خود بہ خود نکلتی جاتی ہیں اور وہ کسی مرحلہ میں جامد اور متقلد نہیں ہوتا اور ہر زبان میں اعلا ذہین اور باذوق استاذ کی یہی شان رہی ہے، ازہر کے سلسلہ میں آگے فرماتے ہیں:

''زیادہ افسوس یہ ہے کہ تعلیم کسی اصول پر نہیں ہے، نہ صف بندی ہے اور نہ کوئی خاص نصاب، نہ امتحان ہوتا ہے نہ ترقی پانے کے لیے کوئی قاعدہ

---

(۱) سفرنامہ روم ومصروشام، ص ۱۷۴ تا ۱۷۶، جدید اڈیشن۔

مقرر ہے، افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان ابتریوں کی اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں، علی پاشا مبارک نے جو کسی زمانہ میں سررشتۂ تعلیم کا افسر تھا، کچھ اصلاح کرنی چاہی تھی، اس پر ازہر کے تمام علما اس کے دشمن بن گئے اور چوں کہ شیخ ازہر کا اثر طلبا پر منحصر نہیں بلکہ تمام ملک اس کو مذہبی پیشوا تسلیم کرتا ہے، اس لیے پاشا موصوف کو اغماض کرنا پڑا، ازہر حقیقت میں ایک ملکی طاقت ہے اور خود سلطنت اس کی مخالفت پر بہ آسانی جرأت نہیں کر سکتی''(۱)۔

علامہ شبلی نے تمام اسلامی ممالک کا عالمانہ اور ناقدانہ مطالعہ کیا اور وہاں کی خوبیوں اور خامیوں کو دوسروں کے فایدہ کے لیے اجاگر کرنے کی کوشش کی اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے ان کو ایک دردمند دل دیا تھا اور جہاں بھی مسلمانوں کی ابتری اور بدحالی ان کو نظر آتی وہ بے چین ہو جاتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو شاعرانہ اور عاشقانہ دل بھی دیا تھا اور ان کو جہاں بھی امت اسلامیہ میں ترقی اور حوصلہ کی شعاعیں نظر آئیں تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا، بلکہ یوں کہیے کہ ان کے دل کی کلی کھل جاتی اور ان کا شاعرانہ ذوق چٹکیاں لینے لگتا اور شعر وفن کی لہروں میں جہاں ان کے جذبات نظر آتے تو پڑھنے والے پر بھی وجد و کیف طاری ہو جاتا، اپنے طویل سفر کے بعد ان کو اپنے ملک ہی واپس ہونا تھا اور ایک نئے جوش اور نئے حوصلہ سے واپس ہونا تھا، نہ ان کو کسی ترقی کی خواہش تھی اور نہ دولت و شہرت کی تمنا، اللہ نے انہیں جو علم و ادب سے نوازا تھا، اس پر وہ قانع تھے اور اس کو اپنے لیے دنیا کی عزیز تر نعمت تصور کرتے تھے، اسی پر وہ اپنے رب کے شاکر بھی تھے، ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان ایک پھیلا ہوا ملک ہے جس کو ہم کسی اعتبار سے برّاعظم بھی کہہ سکتے ہیں، جہاں مسلمانوں نے سالہا سال حکومت کی ہے اور اس کے [illegible] اسلامی علوم وفنون کی بنیادیں ہیں، ان بنیادوں کو باقی رکھنا ہے اور زمانہ کے لحاظ سے ان کو آگے بھی بڑھانا ہے، کوئی بھی چیز کتنے ہی اعلا پیمانہ کی ہو اگر اس کو زمانہ کے لحاظ سے آگے نہیں بڑھایا گیا اور حالات سے مطابقت نہیں پیدا کی گئی تو وہ چیز مرجھا جائے گی اور آہستہ آہستہ اس کی جڑیں کمزور ہو جائیں گی اور وہ معمولی ہواؤں کا بھی مقابلہ نہیں کر پائے گی، ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان

(۱) سفرنامہ روم و مصر و شام، ص ۲۰۴۔

کا مسلمان جن حالات سے گزر رہا تھا ان کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اتنا بیان کرنا مناسب ہوگا کہ مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے باوجود ۱۸۵۷ء کے بعد کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں تھا جہاں ہندوستان کا مسلمان پناہ لیتا اور نئے حالات کے مطابق وہاں جا کر تعلیم و تربیت حاصل کرتا، یہ مسلمانوں کی بہت بڑی بدقسمتی تھی، ان کے آباء واجداد نے بڑے بڑے محلات، مقبرے، شان دار عمارتیں، لمبی لمبی سڑکیں اور شاہ راہیں بنائیں لیکن یہاں کے لوگوں کی ذہن سازی اور ترقی کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، اب یہاں کے مسلمانوں کو خود سے اپنی بقا اور عزت کے لیے کچھ کرنا تھا، اس طرح دو طریقہ تعلیم کا وجود میں آنا ضروری تھا، پہلا بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے تعلیم و تربیت کے جو اصول مرتب ہو رہے تھے اور تعلیم کا جو نہج قایم ہو رہا تھا اس کو بغیر اپنائے ہوئے ہندوستان کا مسلمان اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتا تھا اور جدید نہج سے ہماری مراد وہ علوم ہیں جن سے زندگی کی نئی نئی راہیں وجود میں آتی ہیں اور انسان ترقی کی راہوں پر چل کر ہمیشہ اپنی قوم کو آگے بڑھاتا رہتا ہے اور اس نہج کو کارآمد بنانے کے لیے نئے اسکول، نئے ادارے، نئے دارالعلوم، نئی جامعات وجود میں آئے، ہندوستان میں ان کا ایک طویل سلسلہ ہے اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، علامہ شبلی کو اس نئے نہج اور منہج میں تبدیلی کی کوئی فکر نہیں تھی کیوں کہ ان اداروں میں پڑھانے والے اور تربیت دینے والے زیادہ تر وہ اساتذہ ہیں جو اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے نصاب تعلیم پر ان کی نظر ہے، وہ لوگ زمانے کے مطابق علوم وفنون کے نصاب کی ترتیب میں منہمک ہیں کیوں کہ ان اداروں کی تعلیم و تربیت میں تقلید کی کوئی گنجایش نہیں، اگر کوئی نصاب تعلیم تقلید کی بنیادوں پر کسی ادارہ میں مرتب کیا جائے گا تو اس کی دیواریں منہدم ہو جائیں گی، دوسرا طریقہ تعلیم جن کی بنیاد رکھنے والے مسلمانوں کے مخلصین کا وہ طبقہ ہے جس کو مسلمانوں سے درد کے ساتھ ساتھ ان کے دین اور عقیدہ کے بقا کی فکر تھی اور انہیں اس بات کا خوف تھا کہ اگر مسلمانوں کے دین و عقیدہ کی حفاظت کی فکر نہیں کی گئی تو مغرب کی طرف سے طوفان ہواؤں کا جو سلسلہ ہے، اس سے ان کا مذہب اور عقیدہ ختم ہو جائے گا، چنانچہ انہوں نے مدارس عربیہ اسلامیہ کا پورے ہندوستان میں جال بچھانے کا پروگرام بنایا اور انہوں نے جو قدیم مدارس میں درس نظامیہ کا سلسلہ تھا اس کو نئے

اداروں میں شروع کیا اور نصاب کی ترتیب میں کوئی بہت زیادہ جدت نہیں کی اور عوام نے جو درس نظامی کے نام سے واقف تھے بڑی آسانی سے اس نصاب تعلیم کو قبول کرلیا اور یہ سلسلہ بڑھتا گیا، چنانچہ جدید طرز کے اداروں میں ہر روز نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن اس کے مقابل میں دینی ادارے جہاں جو کچھ اسلاف کی منصوبہ بندی جس طرح پائی گئی اس کو لا گو کردیا تھا جس میں جدت کی کوئی گنجایش نہیں تھی، ان حالات میں کچھ اہل دل اور مخلصین کی ایک جماعت کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ایک ایسے ادارہ کی بنیاد رکھی جائے جس میں دینی علوم کو نئے زاویہ سے سوچا جائے اور اس کے مطابق وہاں نصاب تعلیم مرتب کیا جائے، چنانچہ اس ادارہ کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں دارالعلوم، ندوۃ العلما کے نام سے مشہور ہوا اور وہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، اس طرح علامہ شبلی کے سامنے تین طرح کے ادارے تھے: ۱- جدید طرز کی جامعات اور ادارے، ۲- قدیم طرز کے مدارس اور درس گاہیں اور ۳- جدید و قدیم طرز کے بیچ کا ادارہ، علامہ شبلی کو جدید طرز کے اداروں میں کچھ نہیں کرنا تھا کیوں کہ وہ زمانہ کے مطابق خود بہ خود تیز گام تھے، اب ان کے سامنے قدیم طرز کے ادارے اور دارالعلوم، ندوۃ العلما ہی تھے، قدیم طرز کے اداروں کے حالات سے علامہ شبلی پوری طرح واقف تھے، وہاں کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کی ذہنی سطح ان کی نظر میں تھی، جمود اور تقلید کی زنجیروں میں وہ ایسے جکڑ چکے تھے جہاں اصلاح کی کوئی گنجایش نہیں تھی اور نہ کوئی وہاں اصلاح کی کوشش کرسکتا تھا، اب ان کے سامنے صرف دارالعلوم ندوۃ العلما ہی تھا جہاں جا کر وہ اس ادارہ کی خدمت کرتے اور اپنے تجربہ اور علم کی روشنی میں جدید سے جدید تر بنانے کی کوشش کرتے، یہ مولانا کی خواہش اور تمنا تھی اور اسی حوصلہ اور خواہش کے مطابق انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما میں قدم رکھا۔

کوئی بھی نظام تعلیم ہو اس کے اندر وسعت و جامعیت اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ حالات کے تحت اس کی ترتیب عمل میں نہ آئی ہو ہندوستان کے جتنے قدیم مدارس تھے اور ہیں جس علاقہ یا جس زمانہ میں قایم کیے گئے، ان کے قایم کرنے والوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ جو ادارہ وہ قایم کررہے ہیں اس کا بنیادی مقصد کیا ہے اور زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنے کے لیے ذہین اور دور اندیش علما کیسے پیدا ہوسکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پرانے طرز کے ادارے جن کو قایم

کیے ہوئے مدت گزر گئی ہے، اس زمانہ میں بھی تبدیلی لانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی نہ کی جارہی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے جس پٹری پر گاڑی چل رہی ہے وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوجائے گاڑی اس پر چلتی رہے گی، دارالعلوم ندوۃ العلما کا قیام جس زمانہ میں ہوا اور اس کے قایم کرنے میں یا اس کے بنیادی مسائل پر غور کرنے میں ہر مکتبہ فکر و خیال کے علما شامل تھے، اس لیے اس کے منشور اور منصوبہ میں جدید و قدیم کے طریقے اپنانے کا اعلان کیا گیا لیکن ایسا لگتا ہے کہ علما کی ایک بڑی جماعت جو اس منصوبہ کے بنانے اور مرتب کرنے میں شامل تھی، ان کے ذہن میں جدید و قدیم کا کوئی واضح تصور نہیں تھا یا جن بنیادوں پر وہ اس کو جدید و قدیم کا سنگم بنانا چاہتے تھے، آگے کی پیچیدگیاں اور مشکلات ان کے ذہن میں نہیں تھیں، اس لیے اس کا منصوبہ اور منشور کاغذ کے صفحات پر منحصر ہوکر رہ گیا اور اس میں بنیادی تبدیلی کی کسی کے اندر ہمت نہیں تھی، اس لیے ظاہر میں تو اس کو جدید و قدیم کا سنگم قرار دیا گیا لیکن اندرونی طور پر اس کے اور درس نظامی کے نصاب اور طریقہ تعلیم میں کوئی فرق نہیں تھا اور اس میں پڑھانے والے زیادہ تر وہی اساتذہ تھے جن کی تعلیم درس نظامیہ کے طریقہ پر ہوئی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ اس میں کچھ ایسے بھی اساتذہ تھے جن کو اپنے اپنے موضوع سے پوری واقفیت تھی بلکہ اس میں وہ کمال کا درجہ رکھتے تھے لیکن جہاں تک تعلیم کی جامعیت اور وسعت کا تعلق ہے، وہاں تک ان کے ذہن کی رسائی نہیں تھی، علامہ شبلی جن کی کسی مدرسہ یا ادارہ میں باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی تھی اور نہ ان کو کسی شیخ طریقت سے وابستگی تھی، علم کی راہوں کو انہوں نے اپنے ذوق و شوق سے طے کیا تھا اور زمانہ کے مقتدر اساتذہ سے فیض یاب ہوئے تھے، دینی علوم کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور زبان و ادب کا ان کا فطری ذوق ادب و تنقید کی راہوں سے سیر کراتا رہا، اس طرح بیسویں صدی کے علما میں ان کو جو کمال اور قدرت حاصل ہوئی وہاں سے تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس کو نصاب تعلیم پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے مسائل سے غیر معمولی وابستگی تھی اور ان کی زبوں حالی پر ان کو جو درد و کرب محسوس ہوتا تھا، یہ دولت کم لوگوں کو نصیب ہوئی تھی۔

دارالعلوم میں قدم رکھنے سے پہلے علامہ شبلی طبقہ علما میں ادیب، شاعر، ناقد، مورخ، سیرت نگار اور متکلم کی حیثیت سے روشناس تھے اور علما کی نظروں میں ان کی غیر معمولی عزت و اہمیت تھی لیکن

دور سے محبت وعقیدت کا جہاں تعلق ہے بڑی آسان چیز ہے اور اپنے گھر میں داخل کر کے اس محبت وعقیدت کو باقی رکھنا، ان سے مشورہ لینا، ان کی باتوں کو سننا اور عمل کرنا آسان بات نہیں تھی اور نہ علامہ شبلی کو اس بات کا احساس یا خیال تھا کہ وہ جس گھر میں قدم رکھ رہے ہیں، ان کی وہاں قدر دانی کے بجائے ناقدری ہوگی، علامہ شبلی ندوۃ العلما میں پرانی مشین کے پرزہ کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتے تھے، کیوں کہ پرزہ کی حیثیت سے ان کو رہنا ہوتا تو علی گڑھ میں جتنا ان کا احترام و اکرام تھا اور جتنی خوشحالی کی زندگی وہ بسر کر رہے تھے، اس کو خیر باد نہ کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بے قرار اور بے تاب دل کسی منزل پر ہمیشہ نہیں ٹھہر سکتا، کیوں کہ اس کے سامنے بہ سے بہتر کی طلب ہوتی ہے اور بہ سے بہتر کا طالب اور متوالا سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، اپنے جذبات اور اپنی فکر میں زنگ لگنا پسند نہیں کرتا، دار العلوم ندوۃ العلما اس میں شبہ نہیں کہ پورے برصغیر میں نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ وجود میں آیا تھا اور ملت کے ہر طبقہ میں اس کے منشور اور منصوبہ کا خیر مقدم کیا گیا تھا، کیوں کہ پرانے طرز کے اداروں کی پورے ہندوستان میں کمی نہیں تھی، چنانچہ علامہ شبلی نئی امنگ اور نئے حوصلوں کے ساتھ دار العلوم میں آئے اور اپنی فکر اور وسعت علم کے مطابق اس کے ڈھانچہ میں حالات کے مطابق تبدیلی لانے میں سرگرم ہوگئے اور اس کے ذمہ داروں کے ساتھ اس مسئلہ پر کھل کر گفتگو کرنی شروع کی اور جو بھی منصوبے ان کے ذہن میں تھے، ان کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے، دار العلوم ندوۃ العلما کی مجلس منتظمہ میں علما کے ساتھ ساتھ نئے دور کے تعلیم یافتہ حضرات بھی تھے، اس لیے ان کو پوری امید تھی کہ ان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں علما کی طرف سے اگر کچھ تامل منول کیا گیا تو ان حضرات کی تائید ان کو حاصل ہوگی اور دار العلوم کو نئے سانچہ نئے ڈھانچہ میں آسانی سے ڈھال دیا جائے گا لیکن ایسا لگتا ہے کہ علامہ شبلی کو علما کی طرف سے بے اعتنائی نظر آئی تو نئے دور کے تعلیم یافتہ حضرات نے بھی ان کی کوئی مدد نہیں کی، اس طرح علامہ شبلی تن تنہا اس ادارہ کے نئے اصولوں کی تعمیر و ترقی میں لگے رہے اور ہر قدم پر ان کو شدید مخالفت ومزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، کسی ادارہ میں بنیادی تبدیلی کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کی از سر نو منصوبہ بندی کی جائے اور ہر فن کے ماہرین اس کے نصاب تعلیم کے بنانے میں یک جان دو قالب ہو کر لگ جائیں، ایک عالم خواہ وہ اپنے موضوع پر کتنی ہی مہارت رکھتا ہو

وہ کسی ادارہ کے تمام موضوعات کے نصاب تعلیم کی ترتیب میں کامیاب نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر فن کے ماہر سے مدد لینی ضروری ہوگی لیکن ایسا لگتا ہے کہ طبقۂ علما جن کے ہاتھ میں ندوۃ العلما کی باگ ڈور تھی جن کی للہیت، خدا ترسی، اخلاص اور ان کی جدوجہد میں کسی حیثیت سے شبہ نہیں کیا جا سکتا، وہ ہر مسئلہ میں اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس طرح مخالفت ومزاحمت، کشمکش ورسہ کشی بڑھتی گئی اور اصول ونظریات سے ہٹ کر ایک دوسرے نے ہر ایک پر الزام وتہمت لگانی شروع کر دی اور الزام واتہام صرف اندرون خانہ ہی نہیں رہا بلکہ ان کو عوام تک بھی پہنچانا شروع ہو گیا اور اس طرح بدگمانی کی فضا بد سے بدتر ہوتی گئی، ایسا لگتا ہے کہ علامہ شبلی دار العلوم کی بنیادی تبدیلی کا ڈھانچہ بنانے میں اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں تنہا ہو گئے اور کسی جہت سے بھی ان کو تائید کی کوئی کرن نظر نہیں آئی اور جو لوگ بھی ان کے نظریات کے ہم نوا و موید تھے، انہوں نے علما کی جماعت کے سامنے خاموشی ہی اختیار کی، اس طرح علامہ شبلی کو وہاں سے نامراد و ناکام ہو کر واپس ہونا تھا، اگر علامہ شبلی کے ذہن کے خاکہ کو سامنے رکھا جائے جس کا وقتاً فوقتاً وہ اپنی مجلسی گفتگوؤں اور مضامین ومقالات میں اظہار کرتے رہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ دار العلوم ندوۃ العلما کو علم ومعرفت کے اعلا درجہ کا ادارہ بنانا چاہتے تھے اور جس میں ہر موضوع وہر مضمون کے اعلا پایہ کے اساتذہ کا تقرر ہونا چاہیے، اس سلسلہ میں ان کے ذہن میں مصر کے قاہرہ کے کلیۃ دار العلوم کا نقشہ تھا جس کی انہوں نے اپنے سفر نامہ میں غیر معمولی تعریف کی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خود علامہ کو ہندوستان کے صحیح حالات کا پوری طرح سے اندازہ نہیں تھا، کیوں کہ یہاں اعلا درجہ کے تعلیمی ادارہ کے قیام کا یہ مطلب تھا کہ ہر موضوع کے اعلا درجہ اساتذہ کا انتخاب ہو اور اس میں تعلیم پانے والے طلبہ کے ذہن میں بھی وسعت وحوصلہ ہو مگر علامہ کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اعلا درجہ کے تعلیمی یافتہ اساتذہ کو کہاں سے لائیں گے، کیوں کہ اس وقت کے اساتذہ یا تو جامعات کے تعلیمی یافتہ تھے یا قدیم مدرسوں کے تعلیم یافتہ، جہاں تک جدید تعلیم یافتہ اساتذہ کا تعلق تھا ان کو دینی اداروں میں کسی طریقہ سے کھپایا نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی دینی ادارے ان کے اخراجات کے متحمل ہو سکتے تھے اور جہاں تک قدیم اداروں کے تعلیم یافتہ علما کا تعلق تھا، وہ ہر موضوع کو حالات کے مطابق پڑھا سکیں اور اس کے مطابق ادارہ کو آگے بڑھا سکیں، ایسا بھی ممکن نہیں تھا، دوسری چیز

علامہ جس طرز تعلیم کے متمنی تھے اس کے لیے کافی رقم بھی درکار تھی لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ اس اعلا درجہ کی تعلیم حاصل کر کے طلبہ کے لیے مستقبل میں کہاں گنجایش ہوگی، جہاں وہ رہ کر جس طرح ان کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرسکیں، ظاہر ہے حکومت میں اس طرح کے تعلیم یافتہ افراد کی کوئی گنجایش نہیں تھی، کیوں کہ حکومت میں انہیں لوگوں کی گنجایش ہوسکتی ہے جو نئے طرز کے اداروں اور جامعات کے تعلیم یافتہ ہوں، حکومت میں جگہ حاصل کرنا، خواہ محکمہ تعلیم ہو یا محکمہ عدلیہ یا حکومت کے انتظامی معاملات، ان میں دینی اور مذہبی اداروں کے فارغین کے لیے کسی طریقہ کی گنجایش نہیں تھی، علامہ شبلی نے کلیۃ دارالعلوم قاہرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس میں ہر موضوع کے اعلا درجہ کے اساتذہ تعلیم دے رہے تھے اور اس کی سرپرستی خود حکومت کر رہی تھی، اس لیے اونچی سے اونچی تنخواہیں وہاں کے معلمین اور مدرسین کو مل رہی تھیں اور وہاں سے جو طلبہ اعلا تعلیم حاصل کر کے نکلتے تھے، مصر ہی نہیں بلکہ تمام بلاد عربیہ میں مدارس کی تعلیم و تدریس کے لیے کلیۃ دارالعلوم کے فارغین کو ترجیح دی جاتی تھی، اس لیے ان کے عمل کا دائرہ بہت وسیع تھا، اس میں کچھ ایسے بھی تھے جنھیں اپنے موضوع میں امتیاز حاصل ہوتا تھا، حکومت اپنے خرچہ پر یورپ کی اعلا درجہ کی یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے اور اعلا درجہ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے بھیجتی تھی اور وہاں سے واپسی کے بعد انہیں مصر اور دوسرے عرب ممالک کی جامعات میں عربی زبان و ادب و اسلامی ثقافت کا استاذ مقرر کیا جاتا تھا اور ان کا ہر جگہ خیر مقدم ہوتا تھا اور اس ادارہ کے تعلیم یافتہ طلبہ کو ہر درجہ کی عدالتوں میں پرسنل لا کا جج مقرر کیا جاتا تھا اور وہ ترقی کر کے ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک کے جج کا درجہ حاصل کرسکتے تھے، ہندوستان کے ماحول میں اس طریقہ کے ادارہ کو قائم کرنے کی نہ گنجایش تھی اور نہ یہاں کے فارغین کو اپنے ذوق و صلاحیت کے مطابق کام کرنے کی گنجایش تھی، کسی بھی دینی ادارہ کے تعلیم یافتہ طالب علم کی گنجایش صرف عربی مدارس میں ہی ہوسکتی تھی یا اپنے ذوق و شوق کے مطابق تصنیف و تالیف کے میدان میں ترقی کرسکتا تھا لیکن بغیر کسی معاشی سرپرستی کے اس میدان میں ترقی کرنا یا اعلا منزل تک پہنچنا آسان نہیں تھا، اس طرح علامہ شبلی کو دارالعلوم ندوۃ العلما کو قاہرہ کے دارالعلوم کے طرز پر لانے میں کہیں سے بھی تائید کی روشنی نظر نہیں آئی اور اگر تائید بھی کسی جہت سے ہوتی تو اعلا درجہ کے تعلیمی ادارہ کو اپنے ذوق کے مطابق بنانے میں ان کو بھی کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی

تھی، کسی نصاب میں جزئی تبدیلی لانے میں اتنی پریشانی نہیں تھی اور خود دارالعلوم ندوۃ العلما کے منتظمین جزئی تبدیلی لانے میں علامہ شبلی کی تائید کے لیے تیار تھے لیکن ان کی یہ بھی شرط تھی کہ یہ تبدیلی بھی آہستہ آہستہ ہونی چاہیے، بہرصورت علامہ شبلی دارالعلوم ندوۃ العلما میں اپنی فکر کے مطابق تبدیلی لانے میں ناکام رہے(۱)۔

اس کے بعد انہوں نے ادھر ادھر بھی ہاتھ پیر مارے، کبھی بھوپال اور کبھی حیدرآباد میں اپنے خاکہ کے مطابق ادارہ قایم کرنے میں ناکام رہے اور آخر میں ان کی ناکامی نے ان کو ہر اعتبار سے افسردہ کردیا، چنانچہ وہ تعلیمی و تدریسی ادارہ کے قیام میں مایوسی کے بعد ایک تحقیقی و تصنیفی ادارہ کے قیام کا خواب دیکھنے لگے اور اپنے وطن اعظم گڈھ میں اپنے خواب کی تعبیر دارالمصنفین کی شکل میں پوری کرنے میں لگ گئے اور یہ ادارہ مختلف میدانوں اور راہوں سے گزرنے، مشکلات کا سامنا کرنے اور ناکامی کی شدتوں کو جھیلنے کے بعد قایم ہوا تھا تو قدرت نے ان کے درد اور سوز کی لاج رکھی اور یہ ادارہ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب، اسلامی ثقافت و تمدن اور علوم اسلامیہ کی تصنیف و تالیف کا سب سے بڑا مرکز بن گیا اور آج تک قایم ہے، اس ادارہ کی تصانیف و تالیفات نے ثابت کردیا کہ دردمند دل اگر ہر جگہ ناکام ہوکر اپنی آخری منزل کو اپنی سعی و عمل کا محور بنادے تو اس کے اچھے نتائج یقیناً وجود میں آتے ہیں اور دارالمصنفین اس کی زندہ مثال ہے۔

دوسری طرف اگر ہم ان مدارس کو دیکھیں جن کی باگ ڈور کسی خاص گروپ یا جماعت کے ہاتھوں میں تھی، جن کو وہ اپنی فکر و سمجھ اور صلاحیت کے مطابق چلانے میں لگے رہے اور اس میں ذرہ برابر تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں تھے تو انہوں نے اچھا کیا یا برا؟ صحیح کیا یا غلط؟ جو کچھ بھی کیا آنے والا مورخ جب ہندوستان میں مدارس کے نظام تعلیم و تربیت پر بحث کرے گا تو وہ صحیح معنی میں فیصلہ کرلے گا کہ کیا ہونا تھا اور کیا ہوا۔

---

(۱) معارف: مضمون نگار کے اس تجزیے سے مکمل اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ علامہ جس قسم کے قدیم و جدید خیال کے حامل علما پیدا کرنا چاہتے تھے، گو ہندوستان اسلامی ملک نہیں تھا تاہم ان کے لیے بعض مواقع یہاں بھی میسر آسکتے تھے اور آئے بھی، علامہ اپنی زندگی میں چاہے اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہوئے ہوں لیکن ان کے بعد ندوۃ العلما اور دوسرے مدارس کو اسی نہج کو اختیار کرنا پڑا جو ان کی کامیابی ہے، اس کی تفصیل "حیات شبلی" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

سفرِ حج کے مشاہدات اور ٹور کمپنیوں کا استحصال

از:- جناب محبوب الرحمان فاروقی ☆

"جناب محبوب الرحمان فاروقی سابق مدیر ماہنامہ "آج کل" اردو دہلی کو اس سال حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی بارک اللہ، ایسے مقدس اور روحانی سفر کو خودغرض اور حریص لوگوں نے حاجیوں کے لیے کس قدر تکلیف دہ اور اذیت ناک بنا دیا ہے، اس مضمون سے اس کا اندازہ ہوگا لیکن مضمون نگار نے حج و مقامات حج اور ان سے متعلقہ امور کے فضائل میں ضعیف اور کم زور روایتیں بھی نقل کی ہیں"۔ (ض)

تمہید اور پس منظر

اللہ رب العزت کے فضل سے امسال مجھے بھی حج کرنے کا موقع مل گیا، ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ماہ اکتوبر میں میرے پاس اتنے مالی وسایل ہوگئے کہ میرے اوپر حج فرض ہوگیا، اس وقت تک حج کمیٹی سے فارم بھرنے کی تاریخیں نکل چکی تھیں، گرچہ کوشش کرنے پر حج کمیٹی کا فارم بھر سکتا تھا لیکن کچھ لوگوں نے پرائیویٹ آپریٹروں کے ذریعہ دی جانے والی سہولتوں کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کیا تھا کہ میں نے بھی پرائیویٹ آپریٹر کے ذریعہ سفر کرنے کا ارادہ کرلیا، اب سوال ہوا کہ کس آپریٹر سے رابطہ قایم کیا جائے، میرے ایک کرم فرما نے لکھنؤ کے ایک آپریٹر کی اتنی تعریف کی کہ میں نے انہیں سے رابطہ قایم کرنے کا فیصلہ کیا، میرے کرم فرما نے مجھے ان کا ٹیلی فون نمبر نہیں دیا بلکہ اپنے برادرِ نسبتی کا حوالہ دیا کہ وہ ان سے رابطہ قایم کرادیں گے، جنہوں نے موقعہ سے فایدہ اٹھاتے ہوئے لکھنؤ کے ایک دوسرے آپریٹر کی تعریف کی اور ان سے

☆ نمبر-اے-سی، بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔

اپنے گہرے روابط کا تذکرہ کیا اور کہا کہ وہ آپ کو ہر قسم کی سہولت دیں گے اور آپ کے سارے ارکان بھی اپنے ساتھ اور اپنے عالم کے ساتھ صحیح صحیح پورا کرائیں گے، نیز آپ جس طرح کی چائے پیتے ہیں اور جس طرح کا کھانا کھاتے ہیں ویسا ہی آپ کو کھانا بھی ملے گا، اپنی سادگی میں میں نے رضامندی ظاہر کردی، دو دنوں بعد وہ اسی آپریٹر کو لے کر دن میں گھر آگئے، ان سے بہت تفصیلی بات چیت ہوئی، انہوں نے ہر طرح کی سہولت دینے کا وعدہ کیا اور اس طرح سے اطمینان دلایا نیز وہاں سہولتوں اور آسایش اور آرام کا اتنا سبز باغ دکھایا کہ میں نے اپنا اور اپنی اہلیہ کا پاس پورٹ مع ایک درجن تصویروں کے انہیں دے دی، اخراجات کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ پیکیج کا 89000 لیتے ہیں لیکن میرے معاملے میں جو پرویز کہہ دیں گے لے لیں گے اور یہ کہ وہ پیسہ بعد میں لیں گے۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ وزارت خارجہ کے حج سیل سے رجسٹرڈ بھی ہیں اور بہت دنوں سے یہ کام کررہے ہیں، ایک ہفتہ بعد پرویز صاحب نے مجھے فون کرکے کہا کہ وہ لکھنؤ جارہے ہیں اور یہ کہ میں اخراجات کی پہلی قسط مبلغ چالیس ہزار روپیہ انہیں دے دوں تاکہ وہ لکھنؤ میں آپریٹر کو خود سونپ آئیں، میں نے ایسا ہی کیا، میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ جب کسی اور آپریٹر کی بات ہوئی تھی تو دوسرے سے انہوں نے بات کیوں کرائی اور یہ کہ پیسہ نقد لے جانے کے پیچھے ان کا مقصد کیا ہے جب کہ عام طور پر اس طرح کی ادائگی بینک ڈرافٹ کے ذریعہ کی جاتی ہے، اس کی وضاحت بہت دنوں بعد مکہ معظمہ میں ہوئی، بہرحال ان آپریٹر کی اصلیت اور فریب دہی اور غلط بیانی کی حقیقت مکہ معظمہ جاکر کھلی۔

ہمارے ٹور آپریٹر کا نام جن سے میرا رابطہ ہوا محمد طفیل ہے، یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اور مختلف ٹور کمپنیوں کے نام کے ساتھ حج و زیارت کے لیے جانے والے لوگوں کو لے جاتے ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی اپنی کوئی کمپنی نہیں ہے، یہ ہر سال الگ الگ رجسٹرڈ اور کچھ غیر رجسٹرڈ ٹور کمپنیوں کے ساتھ مل کر ان کی کمپنی کے نام پر اپنے زائرین کو لے جاتے ہیں، بعد میں میں نے دیکھا کہ اس طرح کے بہت سے گروپ اور کمپنیاں ہیں جو کہیں سے بھی رجسٹرڈ نہیں ہیں جن کا کوئی آفس بھی نہیں ہے، ایسے ہی الگ الگ مختلف علاقوں میں کام کرتی ہیں اور لوگوں کو کسی نام والی ٹور کمپنی کے

نام پر لے جاتے ہیں، یہ لوگ دیہاتوں، دور دراز کے علاقوں میں ضعیف و کمزور خصوصاً بے علم لوگوں، بیوہ اور بے سہارا عورتوں، جن کے کوئی وارث نہیں ہوتا لیکن جو لوگ صاحب استطاعت ہوتے ہیں، ان کا پتہ لگا کر ان سے رابطہ کرتے ہیں، انہیں دنیا بھر کا خواب دکھاتے ہیں، ان سے اپنی نگرانی میں حج کے سارے ارکان پورا کرانے کا ذمہ لیتے ہیں، ان کا پاس پورٹ بنواتے ہیں اور انہیں واپس بخیر و عافیت پہنچانے کا وعدہ کرتے ہیں، یہ غریب لوگ خصوصاً عورتیں فوراً ان کے دام میں آجاتی ہیں، یہ کام پورے سال چلتا رہتا ہے، پہلے شکار تلاش کرنا اور پھر ان کا شکار کرنا، یہ ضعیف مال دار بیوہ اور بے سہارا عورتوں کو سبق پڑھاتے ہیں کہ اگر کوئی تم کو سمجھائے کہ عورتوں کا حج بغیر کسی محرم کے ساتھ کے نہیں ہوتا تو کہیے گا کہ طفیل میرا بیٹا ہے اور اپنے بیٹے کے ساتھ حج کر سکتی ہوں، غرض انہیں ہر طرح کا بہلا وادے کر پھانسا جاتا ہے اور ایسے ہر فرد سے 85 یا 90 ہزار جمع کیا جاتا ہے، اس طرح امسال ہمارے گروپ میں 85 افراد شامل تھے جن میں صرف 6 فرد ایسے تھے جو ہر طرح کی معلومات رکھتے تھے اور جنہیں پڑھا لکھا کہا جاتا ہے، باقی اکثریت دیہاتی، لاوارث اور بے سہارا عورتوں کی تھی اور کچھ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے جاہل افراد تھے جو دستخط کی جگہ انگوٹھے کا نشان لگاتے تھے، اسی طرح بہار کے سمستی پور اور چمپارن ضلعوں کے دیہاتوں میں رہنے والے کچھ اور صاحب استطاعت لوگ ایک دوسرے گروپ کے ساتھ ہمارے ساتھ ہی ایئر پورٹ سے جہاز پر سوار ہوئے، امسال طفیل اور اس دوسرے گروپ نے دہلی میں وزارت لیبر سے رجسٹر یونائیٹڈ ٹور کارپوریشن کمپنی کا تعاون حاصل کیا، یہ کمپنی مزدوروں کی غیر ممالک میں بھرتی کے لیے لیبر وزارت سے رجسٹرڈ ہے لیکن حج اور عمرہ کے لیے وزارت خارجہ کے حج سیل سے رجسٹرڈ یا شناخت شدہ بھی نہیں ہے، اس کے ڈائریکٹر فیض الرحمان صاحب ہیں جو تاج انکلیو میں رہتے ہیں، آدمی شریف ہیں Man Power Export کے سلسلے میں سعودی عرب اکثر جاتے رہتے ہیں، ان کے کچھ معلموں سے بھی تعلقات ہیں، اپنے اسی تعلق کی بہ دولت یہ بھی حج کے لیے لوگوں کو خود کو لے کر جاتے ہیں، اس طرح کے دو تین غیر رجسٹرڈ لوگوں کو اپنی کمپنی کے نام پر لے جانے سے ان کے گروپ کے افراد کی تعداد بڑھ جاتی ہے، معلم کی فیس میں اضافہ ہو جاتا ہے اور معلم ان کے نام پر منیٰ میں ایک دو کیمپ کا انتظام کر دیتے ہیں اور اپنی بسیں بھی فراہم کر دیتے ہیں،

ان کے ساتھ امسال 35 افراد تھے، ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے حاجیوں سے کسی قسم کا وعدہ نہیں کرتے بلکہ صاف صاف بتاتے ہیں کہ انہیں کیا کیا مصایب کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے ان کے گروپ کے کسی فرد کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہوتی، یہ مکہ اور مدینہ شریف میں دوران قیام اپنے لوگوں سے مستقل رابطہ بھی رکھتے ہیں۔

قصہ کوتاہ، وقت ٹکتا جا رہا تھا لوگ رخت سفر باندھ رہے تھے اکثریت روانہ ہو چکی تھی، یہاں حالت یہ تھی کہ طفیل سے فون پر رابطہ ہی قایم نہیں ہو رہا تھا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم لوگ امسال جا بھی سکیں گے یا نہیں یا یہ کہ طفیل رقم اور پاس پورٹ لے کر کہیں غایب تو نہیں ہو گئے، قسمت پر شاکر ہو چکے تھے، اللہ کی مرضی کے آگے اپنے کو بے بس محسوس کر رہے تھے اور راضی بہ رضا رہنے کی کوشش کر رہے تھے، طفیل نے پہلے بتایا تھا کہ ۱۰ رجنوری کو ہم لوگوں کی روانگی ہوگی، یہاں ۱۰ رجنوری ہو چکی تھی، ان سے رابطہ ہی قایم نہیں ہو رہا تھا، پرویز میاں تسلی دے رہے تھے، یہاں ذی الحجہ کا چاند ہو چکا تھا کہ طفیل کی بیوی نے بتایا کہ ہم لوگ ۱۷ رجنوری کی فلائٹ سے جائیں گے اور یہ کہ طفیل صاحب ۱۶ رجنوری کو ہم لوگوں سے ملیں گے، ۱۷ رجنوری ہندوستان کے حساب سے ۶ رذی الحجہ لیکن سعودی حکومت کے تازہ اعلان کے مطابق ۷ رذی الحج یعنی ۸ رذی الحج سے حج کے ارکان شروع ہو جائیں گے، حاجیوں کے قافلے منیٰ کے لیے روانہ ہو جائیں گے، ہم لوگ اسی ذہنی کرب کا شکار تھے کہ ۱۶ کی شام طفیل صاحب پرویز میاں کے ساتھ تشریف لے آئے، انہوں نے ٹکٹ، پاس پورٹ اور یونائیٹڈ ٹریول کارپوریشن کا دو ایک بیگ بہ طور نشان دہی اور چپل رکھنے کے لیے دیا اور ہم لوگوں سے صبح آٹھ بجے ایئر پورٹ پہنچنے کی تاکید کر کے چلے گئے، ۱۷ رجنوری کی صبح ٹھیک آٹھ بجے ہم لوگ تیار ہو کر ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے، سعودی ایئر لائن سے ہماری فلائٹ ساڑھے بارہ بجے دن میں تھی، ایئر پورٹ پہنچنے کے بعد ہم لوگوں کو طفیل کہیں نظر نہیں آئے، بہرحال ٹکٹ اور پاس پورٹ ساتھ تھا ہم اندر داخل ہوئے، سامان کی چیکنگ ہوئی، صاحب زادگان جو ہمیں رخصت کرنے آئے تھے باہر رہ گئے، ہم لوگ لاؤنج میں بیٹھ کر طفیل کی راہ دیکھتے رہے، ایک بجے کے قریب ہم ہوائی جہاز میں داخل ہوئے، اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے، لاؤنج میں ہی ہم نے احرام باندھ کر حج قران کی نیت کر لی تھی، ہوائی جہاز کی اڑان کا وقت گزر چکا تھا، فلائٹ میں تاخیر

ہورہی تھی، دو بجے کے قریب طفیل میاں مع اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ جہاز میں داخل ہوئے، انھوں نے بتایا کہ وہ باہر لوگوں کو جمع کررہے تھے، طفیل میاں کے سارے وعدے وعید کی قلعی کھل چکی تھی، ان کی کذب بیانی ظاہر ہوگئی تھی، ہم لوگ اللہ کا نام لے کر اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے اور تلبیہ کہتے رہے، جہاز میں سوار لوگوں سے ہم ناواقف تھے، کسی سے ربط ضبط نہیں ہوسکا، تقریباً ڈھائی بجے جہاز نے اڑان بھرنا شروع کیا ہم سطح زمین سے کافی اونچائی پر پہنچ چکے تھے، زمین دھندلی اور ہر چیز دھند میں لپٹی نظر آرہی تھی، بادلوں کی سیاہی سے اوپر ہمارا جہاز پرواز کررہا تھا، اس دوران ٹی وی اسکرین پر فاصلہ اور وقت اور ہم کہاں سے پرواز کررہے ہیں کے نقشے آتے رہے، عصر کا وقت ہوا، سعودی ایئر لائن میں نماز کی جگہ بنی ہوئی تھی، البتہ وضو اور رفع حاجت کے لیے جگہ بہت تنگ تھی اور سب جدید تکنیک سے آراستہ ہندوستانیوں کی اس سے ناواقفیت، جو حشر ہوسکتا تھا اس کا تصور کرلیجیے، سبھی لوگ احرام میں تھے، دو دو چار چار کرکے نماز کی ادائگی کرتے رہے، معلوم ہوا کہ ہم مغرب کی نماز جدہ ائیر پورٹ پر پڑھیں گے، سات بجے کے قریب ہمارے طیارے نے جدہ ایئر پورٹ پر لینڈ کیا، ہر چہار طرف سے حاجی آرہے تھے، مغرب سے فارغ ہوکر ہم اندر ایئر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے، پاس پورٹ اور سامان کی چیکنگ ہوئی، معلم کے آدمیوں نے بڑی بے دلی کے ساتھ کارروائی پوری کی، چائے کی طلب ہورہی تھی، سامان وغیرہ لاد کر لاؤنج میں داخل ہوئے، ایئر پورٹ کا عملہ ہندوستانی اور انگریزی سے نابلد، ان سے رابطہ کیسے قایم ہو، چائے مل رہی تھی لیکن اس کے لیے سعودی ریال کی ضرورت تھی، لاؤنج میں نظر دوڑانے پر صرافہ کا کاؤنٹر نظر آیا، ہر جگہ طویل قطاریں تھیں، میں نے ہندوستانی پانچ سو کا نوٹ بڑھایا، مجھے اس کے عوض ساڑھے سینتیس سعودی ریال ملے، دو دو ریال کی دو چائے لی، رات کے دس بج چکے تھے، بھوک لگ رہی تھی، ہم لوگ انتظار میں تھے کہ شاید طفیل میاں کچھ کھانے کا انتظام کریں، ادھر خاموشی، وہ نہ جانے کہاں غایب تھے، ساڑھے گیارہ بجے میری اہلیہ سے برداشت نہیں ہوا، انھوں نے بارہ ریال دے کر ایک پلیٹ بریانی لی، جو کئی آدمیوں کے لیے کافی تھی، اپنے ساتھ انھوں نے کئی اور لوگوں کو شامل کیا، وہیں لاؤنج پر نماز کا انتظام تھا، عشاء کی ادائگی کی گئی، بے چینی تھی کہ کب ہم لوگ یہاں سے باہر نکلیں، مکہ پہنچ کر طواف قدوم کرنا ضروری

تھا، معلم کی طرف سے بس ہی نہیں آرہی تھی، بیٹھے بیٹھے رات گزر گئی، فجر کے لیے وضو کیا، معلوم ہوا بس آنے والی ہے، جلدی جلدی نماز پڑھی گئی اور سامان کے ساتھ قطار لگا کر کھڑے ہوگئے، آٹھ بجے صبح بس آئی، سامان رکھا گیا، بس مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئی، حالاں کہ جدہ سے مکہ معظمہ کا فاصلہ مشکل سے ایک گھنٹہ کا ہوگا، بس میں معلم کے آدمی چڑھ گئے، گنتی شروع ہوئی، نام پکارے گئے، کچھ دوسرے معلم کے لوگ چڑھ گئے تھے اس میں تکرار ہوتا رہا، ایک گھنٹہ بعد معلم کے آدمیوں نے ایک ایک پٹہ جس پر معلم جسے مکتب بھی کہتے ہیں کا نام چھپا تھا، ہمیں پہننے کے لیے دیا، ان آدمیوں کا رویہ اچھا نہیں رہتا، یہ بہت ترشی سے بات کررہے تھے، ان کی زبان تو سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن لہجے سے اندازہ ہورہا تھا، مکہ معظمہ میں ہر چہار طرف احرام میں ملبوس مختلف رنگوں اور نسلوں کے آدمی اپنی اپنی بسوں کا انتظار کررہے تھے، خدا خدا کرکے ڈیڑھ بجے دن میں ہم مکہ معظمہ میں اپنی قیام گاہ کے پاس پہنچے، قیام گاہ کیا تھی، مکہ میں جہاں شاہ راہ خلیل ختم ہوتی ہے اس کا نام مسفلہ کبری ہے، وہاں سے سامان ڈھو کر ہمیں ایک مکان میں پہنچایا گیا، حالاں کہ طفیل نے وعدہ کیا تھا سامان وغیرہ ہم لوگوں کو اٹھانا نہیں پڑے گا لیکن وہ ہر جگہ لاتعلق بنا رہا، چند کوٹھریوں پر مشتمل اس پرانے مکان کے کمروں میں بیس بیس لوگ ٹھونسے گئے، سامان کہاں رکھیں، خود کہاں بیٹھیں، یہ مسئلہ بنا رہا، ایک ٹوٹے کے نلکے سے ہم نے وضو کیا، ہمیں چاول دال کھانے کو دیا گیا، یہ جگہ حرم شریف سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، کھانے کے بعد طفیل کا ایک آدمی ہمیں لے کر حرم شریف چلا، اس نے راستہ میں بتادیا تھا کہ ہمیں طواف کیسے کرنا ہے اور ہم لوگ کہاں ملیں گے، ظہر کی نماز پڑھ کر ہم اندر داخل ہوئے، ہم باب عبدالعزیز سے اندر داخل ہوئے، سامنے کعبۃ اللہ نظر آیا، کعبہ پر نظر پڑتے ہی ہم وہیں ٹھہر گئے، دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیا یہ سوچ کر کہ اس جگہ پہنچنے کی کتنی تمنا تھی، ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ہم اپنی ان گنہگار آنکھوں سے کعبہ کو دیکھ سکیں گے، مالک حقیقی نے سبیل پیدا کیا، اسباب مہیا کرائے اور اس وقت ہم اپنی آنکھوں سے کعبہ کا نظارا کررہے ہیں، مجھ جیسے شقی القلب کے بھی اس سعادت پر آنسو نکل آئے، ہم لوگ دیر تک دعا کرتے رہے، ہم نے پڑھا تھا کہ کعبہ پر نظر پڑتے ہی جو دعا کی جاتی ہے، اس کی قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے، اس لیے دیر تک اپنے لیے، اولادوں کے لیے، عزیزو

اقربا اور دوستوں کے لیے بھی دعا کرتے رہے، فارغ ہو کر ہم آگے بڑھے اور جہاں حجر اسود کی نشان دہی کے لیے سبز روشنی لگی ہے، بھیڑ میں گم ہو گئے، طواف شروع ہو گیا، حالاں کہ زیادہ تر حاجی منیٰ جا چکے تھے پھر بھی بھیڑ ہمیں آگے بڑھاتی رہی جو دعائیں یاد تھیں انہیں پڑھتے رہے، دو گھنٹہ بعد طواف مکمل ہوا، مقام ابراہیم سے تھوڑے فاصلے پر نفل پڑھی گئی پھر دعاؤں کا سلسلہ، ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ملتزم کہاں ہے لیکن انداز سے کچھ فاصلے پر کھڑے آہ وزاری میں مشغول ہو گئے، عمرہ کی تکمیل کے لیے سعی کرنا ضروری تھا، ہمیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ صفا مروہ کے لیے کہاں جاتے ہیں اور کتنی دور ہے اس لیے ہم باہر نکل آئے، ہمیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ لوگوں سے بچھڑ نہ جائیں، منیٰ کیسے جائیں گے، طفیل کا کہیں پتہ نہیں تھا، جو صاحب ہمیں لائے تھے وہ ہمیں چھوڑ کر کہیں جا چکے تھے، ہم باہر گھڑی کے پاس انتظار کرتے رہے، مسئلہ یہ تھا کہ واپس کیسے جائیں، راستہ یاد نہیں، پتہ معلوم نہیں، زبان کوئی سمجھتا نہیں، خیر دو چار لوگ نظر آئے جان میں جان میں آئی، عصر کی ادائیگی جماعت سے ہوئی، جائس رائے بریلی میں درگاہ اشرفیہ کے متولی حسن اشرف صاحب نظر آئے، ان سے تعارف دوران سفر ہو چکا تھا، انہوں نے کہیں سے چائے لا کر پلائی اور ان کی ہم راہی میں اپنے ٹھکانے پر پہنچے، جلدی جلدی منیٰ کے لیے سامان بیگ میں رکھا گیا، مغرب کا وقت ہو چکا تھا، کمرے میں ہی نماز ادا کی گئی، آٹھ بجے کے قریب بس آئی، خدا خدا کر کے ہم منیٰ عشا کے وقت پہنچے، ایک خیمہ میں بیس تیس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ملی، عشا کی نماز وہیں خیمہ میں باجماعت ادا کی، ہمیں قاعدے سے فجر، ظہر، عصر اور مغرب سب منیٰ میں ادا کرنی تھی لیکن عشا کی نماز پہلی بار یہاں خیموں میں ادا کر رہے تھے، یہاں کوئی مسجد نہیں ہے (۱) اس لیے الگ الگ خیموں میں لوگ نماز ادا کر رہے تھے، عشا کے بعد روٹی سالن زہر مار کر کے ہم نے لی اور بیٹھنے کے لیے بمشکل تمام جگہ بنائی۔

دوسرے دن صبح یعنی ۹ر ذی الحجہ کو ہم صبح چائے پی کر عرفات کے لیے گاڑی سے روانہ ہو گئے، گرچہ منیٰ سے عرفات کا فاصلہ زیادہ نہیں غالباً چھ کلومیٹر ہے لیکن بھیڑ کی وجہ سے ہماری بس

(۱) معارف: صرف مسجد خیف ہے، اکثر نمازی تنگی کی وجہ سے اس میں جانے والے بھی اس کے باہر نماز ادا کرتے ہیں۔

ڈھائی بجے کے قریب عرفات پہنچی، ہمارا خیمہ مسجد نمرہ کے کافی فاصلے پر عرفات کے حدود کے آخر میں تھا، عرفات بھی جس کی مثال میدان حشر سے دی جاتی ہے، آج خیموں کا شہر بن گیا تھا، مختلف رنگ ونسل کے لوگ ان خیموں میں پناہ گزیں تھے، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے پوری دنیا اس میدان حشر میں سا گئی ہے لیکن ہر شخص ایک جیسے لباس میں ملبوس تھا، کچھ لوگ خیموں سے باہر نکل کر دعا میں مصروف تھے، ہم نے اپنے خیمہ میں ظہر کی نماز ادا کی، مسجد نمرہ میں امام صاحب خطبہ دے رہے تھے، جو مائک کے ذریعہ نشر ہو رہا تھا، عرفات میں ظہر سے لے کر غروب آفتاب تک وقوف کرنا حج کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اتنی دیر کھڑے رہنا ناممکن ہو تو بیٹھ کر یا لیٹ کر بھی دعائیں اور تسبیحات پڑھ سکتے ہیں، بعض علما نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے پانچ منٹ کا بھی وقوف کر لیا تو اس کا حج ہو گیا، بغیر وقوف کے حج نہیں ہوتا، جتنی دعائیں اور جس طرح مانگ سکتا ہو مانگنا چاہیے، جو لوگ مسجد نمرہ میں امام کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، انہیں ایک ہی اذان سے ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کرنی ہوتی ہے، اپنے اپنے کیمپوں میں الگ الگ ظہر اور عصر پڑھتے ہیں، حالاں کہ غروب آفتاب تک یہاں وقوف کرنا چاہیے لیکن طفیل صاحب نے عصر کے بعد سب سے کہا کہ اپنے اپنے سامان کے ساتھ سب لوگ بس پر چلیں ورنہ بس نہیں ملے گی، بس کوئی نہیں تھی، معلم کی طرف سے بس نہیں آئی تھی لیکن لوگ اپنا اپنا بیگ اٹھائے ہوئے ادھر ادھر بھٹکتے رہے، وقوف کا مقصد دعا اور آہ وزاری کرنا نیز اللہ کی حمد کرنا ہے، لوگ کھڑے تو تھے لیکن بس کی فکر میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے، نہ بس ملنی تھی نہ ملی، آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ایک جاتے ہوئے ٹرک کو روک کر ہم چار شخص اس میں پیچھے سوار ہو گئے، ہمیں رات مزدلفہ میں گزارنی تھی، مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشا کی نماز ایک ساتھ ادا کرنی ہوتی ہے، مزدلفہ میں کیمپ نہیں ہوتا ہے رات کھلے آسمان کے نیچے گزارنی ہوتی ہے، مزدلفہ سے ہی رمی جمرات کرنے کے لیے کنکری اکٹھی کرنی پڑتی ہے، بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ اور ماں حوا جنت سے الگ الگ جگہوں پر نکالے گئے تھے، دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں بھٹکتے رہے، عرفات کے میدان میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور مزدلفہ آ کر دونوں نے رات گزاری تھی، قاعدہ سے مزدلفہ میں بھی حمد وتسبیح اور پوری دل جمعی سے دعا اور عبادت میں رات گزارنی چاہیے لیکن تھکان کی وجہ سے اور کھلے آسمان کے نیچے کمبل

اوڑھ کر لوگ تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے ہیں، ہم بھی ایک بجے کے قرب مزدلفہ پہنچے، عرفات سے مزدلفہ کا فاصلہ غالباً تین چار کلو میٹر ہے، مزدلفہ میں جگہ جگہ خواتین اور مردوں کے لیے بیت الخلا اور وضوخانے بنے ہوئے ہیں لیکن جہاں چالیس پچاس لاکھ لوگ اکٹھا ہوں وہاں تل رکھنے کی جگہ بہ مشکل ملتی ہے، خدا کا شکر ہے ہمیں ایک جگہ مل گئی ہم نے اپنی چٹائی بچھالی، صبح تین بجے میں اٹھ گیا کہ جلدی سے استنجا کر کے وضو کرلوں، اس وقت میں نے دیکھا کہ ہر بیت الخلا کے سامنے لمبی لمبی قطار لگی ہوئی ہے تقریباً ساڑھے چار بجے مجھے اتنا موقع ملا کہ استنجے سے فارغ ہو کر وضو کر سکوں، اپنی چٹائی پر تہجد کے لیے کھڑے ہوگئے، فجر کے وقت ہونے پر کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر فرض کی ادائگی کرلی، مزدلفہ سے فجر پڑھنے کے بعد منیٰ ہوتے ہوئے جمرات رمی کے لیے جانا ہوتا ہے، ہم جس ٹرک سے آئے تھے وہ کہاں کھڑی تھی ہم بھول گئے، اب سواری کے چکر میں ادہر اُدہر بھٹکتے رہے، ہمارے کیمپ سے لوگ کب مزدلفہ آئے کہاں ان کا قیام تھا، کچھ پتہ نہیں چل سکا، سات بجے کے قریب خوش قسمتی سے ایک ٹیکسی مل گئی، ٹیکسی والے نے کہا کہ ہم لوگ جمرات کے لیے شام کو جائیں، دو یم بیگ کے ساتھ وہاں جانا ممکن بھی نہیں ہوگا، اس لیے ہم لوگ منیٰ میں اپنے کیمپ سے ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر اتر گئے، ہمارا کیمپ یا معلم کا کیمپ کہاں ہے اس کی تلاش میں ہم بھٹکتے رہے، بہت دیر بعد ہمارے کیمپ کا پتہ چلا، ہمارے ساتھ بلرام پور گونڈہ کے ایک ڈاکٹر اور ان کی اہلیہ بھی تھیں، ہم لوگوں نے عورتوں کو ایک جگہ بٹھادیا تھا کہ کیمپ کا پتہ لگا کر انہیں پھر لے جائیں گے، ہم یہ بھی بھول گئے کہ عورتوں کو کہاں بٹھایا تھا، دھکے کھا کر چلتے چلتے خدا کا شکر ہے کہ وہ جگہ مل گئی جہاں ہم نے انہیں چھوڑا تھا، پھر ہم اپنے کیمپ میں واپس آئے، کیمپ میں دوسرے اور لوگ آچکے تھے، اب مسئلہ رمی کرنے کا تھا، پھر قربانی کا اور پھر حلق کرا کے احرام اتارنے کا، ہمیں اتنی پریشانی نہ ہوتی اگر طفیل صاحب کی بدانتظامی شامل نہ ہوتی یا اس نے لوگوں کو ارکان کی ادائگی کے سلسلے میں سب تفصیلات بتادی ہوتیں، وہ زیادہ تر کیمپ سے غایب رہتا، حاجیوں کو اللہ بھروسے رکھا تھا، جیسے چاہیں حاجی ارکان ادا کریں، پیدل ہوائی چپل پہن کر چلنے سے میرے گھٹنوں میں تکلیف بڑھ گئی تھی، میری محترمہ کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، وہ چلنے کی قابل نہیں تھیں، دو بجے کے قریب سید حسن اشرف نے ہمت کیا اور کچھ لوگوں کو لے کر جمرات

کے لیے پیدل چلے، ہم نے انہیں اپنا وکیل بنا دیا قربانی کے لیے ہم لوگوں نے طفیل کو پیسہ دے دیا تھا، شام تک کچھ پتہ نہیں چلا کہ قربانی ہوئی یا نہیں، مغرب کے وقت تک حسن اشرف صاحب کنکری مار کر واپس آگئے، نو بجے رات میں معلوم ہوا کہ طفیل صاحب نے کسی کی قربانی نہیں کرائی، ہم لوگ اسی طرح احرام میں عشا پڑھ کر کیمپوں میں سو گئے، دوسرے دن یعنی گیارہ ذی الحج کو دو بجے کے قریب طفیل کی شکل دکھائی دی، انہوں نے اطلاع دی کہ ہم سب کی طرف سے قربانی کرا کر وہ واپس آرہے ہیں، اس لیے ہم لوگ حلق کرا کر احرام اتار لیں (واللہ اعلم)، منیٰ میں ہر آٹھ دس کیمپ کے ساتھ چار یا پانچ بیت الخلا (عورتوں کے لیے الگ) اور وضو خانہ بنا ہوتا ہے اور ہر کیمپ میں پچیس تیس لوگ ہوتے ہیں، اس لیے یہاں بھی ہر وقت لمبی قطار لگی ہوتی ہے، جنوبی ایشیائی ملکوں کے لیے سعودی حکومت کی طرف سے کئی معلم جنہیں مکتب کہتے ہیں نامزد ہوتے ہیں، وہی کیمپ لگواتے ہیں اور منیٰ میں قیام کے دوران حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ہمارے معلم نے کھانے پینے کا انتظام نہیں کیا تھا یا ہوسکتا ہے طفیل اور دوسرے اس طرح کے گروپ نے اس کی ذمہ داری خود لے لی ہو، کیوں کہ معلم کی فیس بھی اسی طرح ادا کرنی ہوتی ہے، ہمارے معلم کا کیمپ جہاں ہم لوگوں کا قیام تھا، منیٰ کے آخر میں مزدلفہ تھا، اب سعودی حکومت نے مزدلفہ کے ایک حصے کو منیٰ میں شامل کر دیا ہے، اسی طرح رمی کرنے کی جگہ سے ہمارا کیمپ تقریباً چھ کلو میٹر کے فاصلہ پر تھا، منیٰ کے ان کیمپوں سے جمرات کے لیے کوئی سواری نہیں چلتی ہے، اس لیے کہ تمام راستوں پر ایسے لوگ جو صرف حج کے لیے آتے ہیں یا مقامی لوگ اپنا بستر لگائے ہوتے ہیں، ۱۱ر ذی الحج اور ۱۲ر ذی الحج کو حاجیوں کو کچھ کرنا نہیں ہوتا سوائے رمی کرنے کے، ۱۰ر ذی الحج کو صرف بڑے شیطان کو طلوع آفتاب سے لے کر زوال تک کنکری مارنی ہوتی ہے جب کہ گیارہ اور بارہ کو تینوں شیطانوں کو، اگر بارہ ذی الحج مغرب کے بعد بھی منیٰ میں قیام رہا تو تیرہ کو بھی رک کر رمی کرنی ہوتی ہے، اس کے بعد ہی منیٰ سے مکہ کے لیے روانہ ہو سکتے ہیں، قربانی کے بعد حلق کرا کر اب صرف طواف زیارت کرنی ہوتی ہے، جن لوگوں نے طواف قدوم کے بعد سعی نہیں کیا تھا، انہیں طواف زیارت کے بعد سعی بھی کرنی ہوتی ہے، خاص طور سے ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے حج قران کی نیت کی ہو، ہماری خوش قسمتی سے میرے صاحب زادے مسعود سلمہ جو

مکہ سے ۱۰۰۰ کلومیٹر دور دمام میں رہتے ہیں اور بھتیجے تمثیل سلمہ جو جدہ میں مقیم ہیں، اپنے دوستوں کے ساتھ تلاش کرتے ہوئے ہمارے پاس آئے، ان لوگوں کے آنے سے جو ڈھارس ہوئی، بتا نہیں سکتا، ان لوگوں نے ہمت دلائی اور ہم مغرب کے بعد ان لوگوں کے ہم راہ رمی کرنے کے لیے نکلے، یہ لوگ پورے راستے محترمہ کی ہمت بڑھاتے رہے، راستے میں ایک جگہ سڑک پر ہی عشا کی نماز ادا کی، پھر آگے بڑھتے رہے، ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ اس جگہ پہنچے جہاں شیطان کے نام کی دیواریں بنی ہیں، اب سعودی حکومت نے جہاں شیطان کے مجسمے تھے، لمبی چوڑی دیواریں بنوادی ہیں تاکہ لوگ آسانی سے کنکری مار سکیں، ہم نے بھی الگ الگ ہر جگہ سات سات کنکری ماری، ہم دونوں کے لیے ایک ایک قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا، اس لیے یہ لوگ ہمیں ایسی جگہ لے گئے جہاں مکہ معظمہ کے لیے سواری مل سکے، ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم لوگ حرم شریف پہنچے، رات کے دو بج رہے تھے، ان لوگوں نے ہمیں معذوروں والی کرسی پر بٹھا دیا اور کرسی پر بیٹھ کر ہم نے طواف زیارت کی اور بعد میں سعی بھی، اس کے بعد ہماری واپسی اسی طرح ہوئی، یعنی بہ ذریعہ سواری جمرات تک اور وہاں سے اپنے کیمپوں تک پیدل جب ہم اپنے کیمپ میں داخل ہوگئے، فجر کا وقت ہو رہا تھا، ان بے چاروں کو ہم لوگوں کے لیے اتنی زحمت اٹھانی پڑی، انہوں نے آنا جانا ملا کر تقریباً ۲۵ کلومیٹر کا سفر پیدل طے کیا، اللہ ان دونوں کو جزائے خیر دے، آمین۔ یہ نہ آتے تو شاید ہم لوگ رمی بھی نہ کر پاتے، طواف زیارت اور سعی سے فارغ ہونے کے بعد ہم مطمئن ہوکر لیٹ گئے، کیمپ میں جہاں بیس تیس شخص جمع ہوں نیند آنا مشکل ہے، پھر بھی ہم لیٹے رہے، اٹھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، بدن کا ایک ایک حصہ ٹوٹ رہا تھا، مجھ سے بدتر حالت محترمہ کی تھی، ہماری حالت دیکھ کر ہمارے رفیق بلرام پور کے ڈاکٹر صاحب نے ۱۲ر کو ہماری کنکریاں لے لیں، ہم نے انہیں اپنا وکیل بنا دیا تھا، وہ لوگ شام کو ارادہ کر رہے تھے، چوں کہ طفیل نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود سارے ارکان اپنی نگرانی میں پورے کرائیں گے اور رمی کے لیے سب کو لے جائیں گے، اگر انہوں نے اپنے وعدہ کا پاس کیا ہوتا تو کوئی دشواری نہ ہوتی لیکن طفیل صاحب نے نہ جانے کہاں منہ چھپا لیا تھا، حاجیوں سے اس کا کوئی رابطہ ہی قایم نہیں تھا، ضعیف، بیمار، کمزور عورتیں کیمپوں میں بیٹھی وقت گزار رہی تھیں، انہیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا، جو کسی نے کہہ دیا وہ

انہوں نے کرلیا، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مزدلفہ میں کیمپ ہونے اور کسی سواری کے نہ ہونے سے رمی کے لیے آنے جانے میں ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی، ۱۲ر تاریخ کو صبح سے ہی تیز ہوائیں چل رہی تھیں، کبھی دھوپ نکلتی کبھی سورج چھپ جاتا، تین بجے کے بعد سے ان ہواؤں نے طوفان کی شکل اختیار کرلی، وہ زبردست گھن گرج کے ساتھ بارش اور اتنی تیز ہوائیں چلنا شروع ہوئیں کہ ہم ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ کی طرف اندر ہی اندر بھاگتے کہ کہیں محفوظ جگہ مل جائے، ہوائیں اتنی تیز کہ نیچے سے بچھی ہوئی موٹی قالین بھی ایک طرح سے اڑنے لگیں، الٹ پلٹ ہونے لگیں، جہاں ہم تھے وہاں چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے، اس لیے گھن گرج اور بارش بھی اور تیز محسوس ہوئی، کسی طرح ہم نے عصر کی نماز ادا کی، مغرب سے کچھ پہلے بارش ہلکی ہوئی، بوندا بادی ہو رہی تھی کہ ہمارے معلم کے دو پہلوان وارد ہوگئے اور انہوں نے کیمپ خالی کرنے کا حکم جاری کر دیا، وہ کچھ سننے کو تیار نہیں، انہیں عربی کے علاوہ دوسری زبان نہیں آتی اور ہم عربی سے نابلد، بات کرنا فضول تھا، سامان اٹھا کر باہر کھڑی گاڑی میں جا بیٹھے، جو لوگ منیٰ کے راستے میں بستر لگائے تھے یا جو رمی کرنے گئے تھے ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، لوگوں کے بستر بہہ گئے، گاڑیاں بہہ گئیں، لوگ بارش میں بھیگ رہے تھے، سردی سے کانپ رہے تھے لیکن کوئی درخت کا سایہ بھی میسر نہیں، ہوا یہ کہ سارے لوگوں کو بیمار پڑنا تھا سو وہ پڑے، منیٰ سے مکہ معظمہ کا سفر مشکل سے ایک گھنٹہ کا ہوگا لیکن ہم لوگ مغرب سے پہلے روانہ ہوکر تقریباً ڈیڑھ بجے رات مکہ معظمہ میں مسفلہ کبری پہنچے، پورے راستہ میں جگہ جگہ پانی لگا ہوا تھا، ٹریفک جام تھا، گاڑی رکتے رکتے کسی صورت جائے قیام سے پہلے پہنچی، ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہم لوگوں نے کیچڑ اور غلاظت میں سامان کے بوجھ کے ساتھ پورا کیا اور پھر اسی کال کوٹھری میں قیام تھا، جہاں ہم پہلے بھی کچھ دیر رک کر قیام کر چکے تھے، فیض الرحمان صاحب جن کی کمپنی کے نام سے یہ ٹور ہوا تھا انہوں نے اپنے لوگوں کے لیے بغل میں ایک اور مکان لے لیا تھا، از راہِ مہربانی انہوں نے ہم لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ہی ایک ایک بستر کی جگہ دے دی، سکون کی سانس لے کر لوگوں نے مغرب اور عشا کی نماز ادا کی اور پھر سب لوگ تھکے ماندے سو گئے، کچھ ایسے جیالے بھی تھے جو مکہ معظمہ سے پیدل ہی جمرات تک گئے اور اپنی کنکریاں مار کر صبح تک واپس آگئے، کنکری مارنے کے لیے منیٰ سے جانا ہوتا

ہے، اب مکہ سے جا کر ان لوگوں نے مارا، عجیب وغریب حالات ہونے کے سبب اکثر لوگ ۱۲؍ کو کنکری نہیں مار سکے، کچھ لوگوں نے دن نکلنے پر ۱۳؍ ذی الحج کو قضا رمی کیا، کچھ لوگوں نے یہ بھی نہیں کیا، دم دیا، اسی مسئلہ کی وضاحت نہیں ہوسکی کہ ایا مکہ معظمہ سے جا کر کنکری مارنا صحیح تھا یا نہیں، دوئم کیا اس کی قضا کی جاسکتی تھی، کیوں کہ حالات عجیب وغریب اور لوگوں کے قابو سے باہر ہو گئے تھے، ہم نے جنہیں وکیل بنایا تھا انہوں نے اپنا دم دیا لیکن مجھے نہیں بتایا، مکہ معظمہ میں قیام کے دوران جب میں نے ان سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو انہوں نے صورت حال سے مطلع کیا، فوراً ہی میں نے اپنی طرف سے اور اہلیہ کی طرف سے الگ الگ قربانی کرانے کا انتظام کیا، کسی غلطی پر قربانی کرانے کو دم دینا کہتے ہیں، اب ہم لوگوں کو کچھ نہیں کرنا تھا، سوائے نفلی طواف یا عمرہ کے اور حرم شریف میں پانچ وقت نماز ادا کرنے، تلاوت کرنے یا دعا کرنے کے لیکن مسفلہ کبری جہاں ہمارا قیام تھا حرم شریف سے کافی فاصلے پر تھا، اس لیے ہم لوگ دن میں صرف ایک مرتبہ حرم شریف جا پاتے، باقی وقت پاس میں بنگالیوں کی آبادی میں واقع مسجد میں نماز با جماعت ادا کرتے، جب حاجیوں خصوصاً یورپین ملکوں کے حاجی مکہ سے روانہ ہونے لگے تو ہوٹلوں کے نرخ میں کمی آئی، پھر چار دن تک مسفلہ کبری میں رہنے کے بعد طفیل صاحب نے حرم شریف کے نزدیک ایک شکستہ پرانے ہوٹل جس کا نام دار ہجرہ تھا میں ہم لوگوں کو منتقل کیا، دار ہجرہ میں عمارت حرم شریف کے نزدیک پرانی رہ گئی ہے، باقی سارے ہوٹل پورے طور پر ایئر کنڈیشنڈ اور پندرہ سولہ منزلہ اونچے ہیں، صاف ستھرے جہاں ہر طرح کی جدید سہولتیں موجود ہیں، اب حرم شریف سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر تھے لیکن بھیڑ اور سڑک پر ہر طرف سوڈانی عورتوں کے دکان لگانے کی وجہ سے یہ فاصلہ کبھی بیس منٹ اور کبھی آدھے گھنٹے میں طے ہوتا، بہرحال اب ہمیں موقع مل گیا تھا کہ ہم حرم شریف میں جہاں تک ممکن ہو پانچوں وقت کی نماز با جماعت ادا کریں، طواف کریں اور عمرہ بھی کریں، یہاں قدم قدم پر پاکستانی ہوٹل موجود تھے، ہر جگہ چائے کی دکانیں تھیں، پھل اور جوس وافر مقدار میں بک رہے تھے، اب کسی قسم کی دشواری نہیں تھی، ہر چیز بہت سستی ریال کے حساب لیکن ہندوستانی سکوں میں موازنہ کرنے پر بہت مہنگی، ہم ہندوستانی سکوں کو بھول گئے اور بس ریال کو ہی سستا سمجھتے، مجھے سہولت ہوگئی تھی، طفیل نے جو ہم سے رقم لی تھی اس میں کھانے پینے

کا انتظام شامل تھا لیکن جس قسم کا کھانا وہ دیتے، مجھے پسند نہیں تھا اس لیے مستقلاً ہوٹل میں اپنی پسند کا کھانا کھانے لگا، ہوٹل میں صرف سالن کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی، روٹیاں مفت میں، ہم ایک پلیٹ سالن لیتے اس میں ہم دونوں میاں بیوی جی بھر کر کھاتے اور اس کے بعد بھی بچا رہتا، حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ جب حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو بے سہارا چھوڑ کر جا رہے تھے تو انہوں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ تو اس بستی کو پھلوں اور سبزیوں سے شاداب کردے اور اسے آباد کردے، انہیں کی دعاؤں کی برکت ہے کہ آج مکہ معظمہ بلکہ پورے سعودی عرب میں تازہ پھلوں اور سبزیوں کی بہتات ہے، ایسے ایسے پھل، کیلے اتنے شاداب اور لمبے، سنگترے اس قدر رس بھرے، انگوروں سے رس ٹپکتا ہوا کہ یہاں دہلی میں جہاں دنیا بھر کے پھل ملتے ہیں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، چار ریال میں ایک کلو کیلا جس میں پانچ عدد چڑھتے تھے، دو کھانے پر پیٹ بھر جاتا، ہر قسم کی کھجوریں بسکٹ، کیک اور پاؤروٹی، سعودی حکومت کی طرف سے پورے ماہ بٹنے والی مرغ بریانی کا پیکٹ، کئی لوگ قطار لگا کر کئی کئی پیکٹ لے لیتے ہر پیکٹ میں آدھا مرغ اور آدھی بریانی ہوتی، سبزیاں خصوصاً ہری دھنیا، سویا، پودینہ اس قدر مہک دار اور تازہ کہ بیان سے باہر ہے، کھیرے، ککری، تربوز بھنڈی، تروئی، لوکی، آلو، ٹماٹر، شلجم، چقندر اور نہ جانے کتنی طرح کے ساگ اور سبزیاں جن کی شکل میں پہلی بار دیکھ رہا تھا، ایک ریال میں لیموں (نیبو)، وہاں ایک ریال میں چائے، پانی کی بوتل، پیپسی کا ڈبہ اور پھلوں کا جوس سب ایک ہی نرخ جو چاہیے خریدیے، پانی تو خریدنا نہیں پڑتا کیونکہ حرم شریف کے اندر اور آس پاس کے ہوٹلوں میں زم زم شریف ہر وقت ملتا، ہم لوگ صرف زم زم ہی پیتے رہے، پورا مکہ معظمہ تو چھوڑیے صرف حرم شریف کے آس پاس جتنی طرح طرح کی چیزیں بکتی ہیں، سونے، چاندی کے زیورات کی بڑی بڑی دکانیں، ایسے ایسے نفیس کپڑے، فٹ پاتھ پر بکتے ہوئے جوتے اور چپل اور حرم شریف کے آس پاس جائے نمازوں کے اتنے اسٹال، جنہیں بیچتی ہوئی سوڈانی عورتیں، بھیڑ کی وجہ سے چلنا مشکل، سو ریال سے لے کر پچاس ساٹھ ریال کی جائے نمازیں، تسبیحات طرح طرح کی اور پھر مسواکیں، دنیا بھر کے نوادرات، تیل، چوٹ اور درد میں لگانے والے بام کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو فٹ پاتھ پر موجود نہیں، یہاں کبھی کبھی بلدیہ کی گاڑیاں آجاتیں تو فٹ پاتھ پر بیچنے والے اپنے سامانوں کے ساتھ غایب ہوجاتے، بس تھوڑی دیر کو سڑک خالی

ہوتی پھر وہی بھیڑ، مونگ پھلی سے لے کر تربوز کے بیج تک بک رہے تھے، کھجوریں ایسی ایسی کہ دیکھتے رہ جائیں، بارہ ریال سے لے کر سو ریال تک کلو کی قیمتوں والی، عورتوں کے اگر ساتھ ہوں تو آپ حرم کی طرف آسانی سے نہیں بڑھ سکتے، وہ بھی کیا کرتیں، دکانیں انہیں کھینچتیں، کچھ نہیں تو جائے نمازوں کی قیمت پوچھی جارہی ہے، تہجد کے وقت سے پوری رات یہی چہل پہل ہوتی، ہم ظہر پڑھ کر نکل رہے ہیں اور کمرے میں پہنچنا ناممکن ہوجاتا، عصر کا وقت ہوجاتا، عطر فروش کی جگہ جگہ دکانیں سجی ہوئی اور مہکتی ہوئی، غرض حرم شریف کے قرب میں آجانے سے ہم طفیل کی ساری وعدہ خلافی، کذب بیانی اور حاجیوں سے اس کی بے تعلقی اور بے پروائی کو بھول گئے، کبھی کبھی ان کے موالی ضعیف اور بے سہارا عورتوں کو حرم شریف طواف یا نماز کے لیے لے جاتے، زیادہ وقت وہ کمرے میں ہی پڑی رہتیں، ہمارا قیام ۷ محرم تک مکہ معظمہ میں رہا، ۷ تاریخ کو ہم نے طواف وداع کرلیا اور جتنی دعائیں مانگ سکتے تھے مانگ لیا اور پھر حسرت کی نگاہ کرتے ہوئے مسجد حرام سے واپس ہوئے، ہم نے مغرب کی نماز ہوٹل کے سامنے چھوٹی مسجد مسجد حمزہ میں ادا کی اور پھر بس میں سامان رکھا جانے لگا، ذی الحج کے خاتمے تک زیادہ تر حاجی یا تو واپس جاچکے تھے یا مدینہ منورہ کے لیے رخصت ہورہے تھے، اس لیے حرم شریف میں بھی خوب اندر جاکر نماز پڑھتے، اطمینان سے جگہ ملتی اور پھر طواف بھی ہم پندرہ بیس منٹ میں پورا کرلیتے، آخر کے دنوں میں حطیم میں بھی نماز (نفل) پڑھنے کا خوب موقع ملا، مقام ابراہیم سے سٹ کر او ٹھیک اس کے پیچھے کہ سجدہ میں ہمارا سر شیشے کی عمارت سے ٹکرا جائے کئی مواقع ملے لیکن ملتزم کو ہم صرف چھو کر دعا مانگ سکے، اس سے سٹنے کے لیے ہمیں دھکم دھکا کرنا پڑتے، اس لیے مناسب نہیں سمجھا، حجر اسود کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا، جو لوگ دھکا دے سکتے تھے اور دھکا سہہ سکتے تھے انہیں بوسہ لینے کا بھی موقع مل گیا، ہم عمرہ زیادہ نہیں کرسکے، اس لیے کہ ترشوانے یا حلق کرانے کے لیے سر پر بال نہیں تھے اور ڈر تھا کہ حلق کے لیے سر پر بار بار استرا چلوانے سے کھال ہی نہ چھل جائے، حج کے ایام میں چوں کہ حرم شریف سے قالین ہٹالی جاتی ہیں، اس لیے ہم جائے نماز خرید کر اس پر پانچ وقت کی نماز پڑھتے، کچھ لوگ خالی فرش پر ہی پڑھتے، ان ایام میں عام طور پر عرب اور مکہ کے باشندے حرم شریف نہیں آتے، وہ حاجیوں کو موقع دیتے ہیں لیکن پہلی محرم سے ان کی آمد شروع ہوجاتی ہے، کچھ لوگ عمرہ کے لیے بھی آنا شروع ہوگئے۔ (باقی)

کشمیر کا گورنر ظفر خان احسن

از:- پروفیسر عبدالاحد رفیق ☆

مغلوں کے عہد حکومت میں اکثر شعرائے فارسی نے ایران، ہندوستان اور دیگر ایشیائی ملکوں کی حکومت ترک کرکے مستقل طور پر کشمیر میں بود و باش اختیار کرلی، کشمیر کے قدرتی مناظر، دل کش اور دل ربا تفریح گاہیں شعرا کو دور دور کے مقامات سے کھینچ کرلاتی تھیں، شعر و شاعری کے لیے جس سکون، صبر اور خاموش ماحول کی ضرورت تھی وہ سب کچھ کشمیر میں میسر تھا، ان شعرا کے کارناموں کی وجہ سے کشمیر کو ایران صغیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جن شعرا نے کشمیر میں اپنی زندگی کے اکثر اوقات اور حصہ بسر کیا ان میں ظفر خان احسن مغل گورنر بھی شامل ہیں، جن کی صحبت میں میر الٰہی میر عماد الدین، ملا شیدا عارف، صائب عثمانی، ابو طالب کلیم، جان محمد قدسی، محمد قلی سلیم، مرزا طاہر آشنا وغیرہ، غرض ایک پوری کہکشاں ہے، ایک ایک سے تابندہ اور درخشاں ہے، ظفر خان احسن کا دربار کشمیر میں شعرا کی آب یاری اور حوصلہ افزائی، ادب پروری، ادب نوازی میں کشمیر کے علاوہ ہندوستان اور ایران تک مشہور رہا تھا۔

ظفر خان احسن کے حالات جن تذکروں میں ملتے ہیں، ان کی تفصیل یوں ہے۔

ذخیرۃ الخواتین، تذکرہ مصر آبادی، کلمات الشعرا از محمد افضل سرخوش، تذکرہ شعرائے متقدمین، مجمع النفائس، تاریخ اعظمی کشمیر، تذکرہ ہمیشہ بہار، تاریخ کبیر کشمیر، تاریخ حسن، ریاض الشعرا، سرو آزاد، مقالات الشعرا، صحف ابراہیم، مرآت آفتاب نما، نتائج الافکار، شمع انجمن، فرمان شاہ جہاں، مسلم رول ان کشمیر، بزم تیموریہ، تذکرہ شعرائے کشمیر، نگارستان، عمل صالح، مکمل تاریخ کشمیر، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ اور لاہور از عبداللطیف۔

نام احسن اللہ، تخلص احسن اور ظفر خان خطاب تھا، ان کے والد خواجہ ابوالحسن تربتی خراسان سے اکبر کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور شہزادہ دانیال کے وزیر اور دکن کے دیوان مقرر ہوئے،

☆ فیکٹری روڈ، اپر صورہ، سری نگر۔

جہاں گیر کے عہد حکومت میں پہلے میر بخش پھر دیوان کل کے عہدے پر تعینات ہوئے، شاہ جہاں کی تخت نشینی کے بعد خواجہ ابوالحسن بیگ تربتی کو صوبہ کشمیر کی حکومت کی گورنری کا عہدہ تفویض کیا گیا، مگر انہوں نے اپنے فرزند مرزا احسن ظفر خان احسن کو اپنا قایم مقام مقرر کیا، اس سے قبل جہاں گیر نے اعتقاد خان کو کشمیر کی حکومت سونپ دی تھی، مگر اس کے دور میں کشمیری عوام کو گوناگوں مظالم اور مصایب کا شکار ہونا پڑا تھا، دیہات اور شہر ویران ہوگئے، قحط سالی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور کشمیر بدانتظامی میں مبتلا ہوچکا تھا اور اکثر لوگوں نے کشمیر سے راہ فرار اختیار کی اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں پناہ لے کر بود و باش اختیار کی، جب بادشاہ ان حالات سے آگاہ ہوا تو اعتقاد خان کو معزول کرنے کے احکام صادر کردیے۔

جب کشمیر کی حکومت مستقل طور پر ظفر خان احسن کو تفویض کی گئی تو شاہ جہاں نے دربار میں فرمایا کہ ظفر خان ضمانت دے کہ اہل کشمیر کو راضی کرسکے، میر عمادالدین میر الٰہی بھی دربار میں موجود تھے، انہوں نے فوراً عرض کیا ع خدا ضامن رسول و چہار یارش - بادشاہ یہ مصرع سن کر بہت خوش ہوا، ظفر خان نے عرض کیا کہ میرے ساتھ میر الٰہی کو کشمیر جانے کی اجازت دی جائے، بادشاہ نے اجازت مرحمت فرمائی اور میر الٰہی کو ظفر خان کے ساتھ کشمیر میں جانے کا موقع مل گیا۔

ظفر خان احسن بے مثال شجاعت اور غیر معمولی کامیابیوں اور ظفریابیوں کے باعث نیک اطوار اور خوش باش بھی تھا، مدبر، منتظم اور خلیق آدمی تھا، طبیعت رنگین پائی تھی، حسن پرست اور قادرالکلام شاعر تھا، اس کے علم و ادب اور شعر و شاعری کی قدردانی اور بذل و کرم کا شہرہ سن کر ملک الشعرائے ایران محمد علی صائب بھی اس کے دربار میں حاضر ہوا تھا اور معقول اکرام و انعام پاکر ظفر خان کی مدح سرائی کی، ظفر خان نے اس کو ایک ہزار اشرفیاں بہ طور انعام بخشی تھیں، چنانچہ صائب خود کہتا ہے ؎

خان خاناں را بہ بزم و رزم صائب دیدہ ام
در سخا و در شجاعت چوں ظفر خان تو نیست

کشمیر کی عنان حکومت ہاتھ میں لے کر اس نے اعتقاد خان سابق گورنر کے وقت کے احکام منسوخ کردیے اور مظالم کی فہرست تیار کرکے بادشاہ کے دربار میں پیش کی اور بدعتوں اور مظالم کی تنسیخ اور قلع قمع کرنے کا فرمان صادر کرایا اور جس کو شاہ جہاں کے ایما پر عوام کی آگاہی کے لیے پتھر

پر کندہ کراکر سری نگر کی جامع مسجد کے دروازے پر نصب کرایا، یہ کتبہ آج بھی جامع مسجد کے دروازے پر کامل و سالم موجود ہے اور شاہ جہاں کی رعایا پروری اور رحم دلی کا ثبوت دیتا ہے، جہاں گیر کے زمانہ میں تسخیر تبت کے لیے فوج کشی کی گئی تھی لیکن سوائے کشت و خوں کے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا، شاہ جہاں نے جلوس تخت نشینی کے دسویں سال ۱۶۴۴ء میں ظفر خان کو تسخیر تبت کا فرمان بھیجا، ظفر خان آٹھ ہزار پیادہ کی جمعیت سے ایک ماہ کے عرصے میں اسکردو پہنچا، یہاں کے مرزبانوں نے دو بلند پہاڑوں پر دو نہایت مضبوط قلعے تعمیر کرائے تھے، ظفر خان نے جب ان قلعوں کی بلندی اور پائیداری کا حال دیکھا تو محاصرے کا رخ بدل کر چال بازی سے کام لیا، کشمیری فوج دو ماہ یہاں قیام کرسکتی تھی کیوں کہ کثرت برف باری اور شدت کی سردی کی وجہ سے راستے بند ہوجاتے ہیں، اس لیے یہاں قیام کرنا بہت مشکل تھا، مگر ان مشکلات پر ظفر خان نے اپنے تدبر، تجربے اور بہادری سے قابو پالیا اور ڈٹ کر مقابلہ کرکے قلعے میں داخل ہوکر بادشاہ کے نام خطبہ پڑھایا، چوں کہ برف کی وجہ سے راہیں بند ہوجانے کا خوف تھا اس لیے ظفر خان عارضی انتظام کرکے اور قیدیوں کو ہم راہ لے کر کشمیر واپس آگیا۔

ظفر خان کو عمارات بنانے اور باغ لگوانے کا بہت ہی شوق تھا اور اپنی نفاست پسندی اور ذوق، فطری مناظر کی دل چسپی کے لیے اس نے سری نگر میں چار باغ لگوائے، ایک سرائنگر کے قریب بریہ واری زونی مر متصل صری بل جھیل آبشار کے قریب ۱۰۴۳ھ میں تعمیر کرایا تھا، دوسرا باغ - باغ گلشن کے نام سے ۱۰۴۴ھ میں یوٹہ کدل (پل بستیاں) تا احمد کدل نہر کے کنارے تعمیر کرایا تھا، تیسرا باغ - باغ احسن آباد (معروف بہ حسن آباد) نایدیار لگوایا تھا۔

اس باغ کی پختہ عمارت کے ساتھ ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرایا تھا جو آج تک قایم ہے، چوتھا باغ - باغ عنایت کے نام سے زیارت سید محمد مدنیؒ کے شمال کے جانب بنوایا تھا جو بہ قول مورخین بہت ہی دل فریب اور دل ربا باغ تھا، نہر کچھ مہ کول اس کے وسط میں بہتی تھی، اس کے علاوہ ظفر خان نے شاہ جہاں کے قلم سے میر الٰہی شاعر کے نام یہ مقام بچھ پورہ باغ الٰہی تعمیر کرایا تھا، یہ باغ چار طبقوں پر مشتمل تھا، ظفر خان خود باغ الٰہی کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہے ؎

فلک آشفتہ بود از بہر سالش
حلک گفتا بگو باغ الٰہی

ز دل چوں جانب صحرا الٰہی روی
جگر صحرا گلستانست خود روی
ببینی سر بہ سر صحرا شگفتہ
بفرش سبزہ گل مستانہ خفتہ
یکے از باغہا باغ الٰہی است
کہ رضوان را ز دلکش چہرہ کاہی است
در آں گلشن یکے کہنہ چنار است
ز نخل طور گوی یادگار است

ایک اور شاعر نے باغ الٰہی کی تعریف میں کہا ہے

گریبان می کشد خواہی نہ خواہی
سوی خود مرا باغ الٰہی

یہ باغ ظفر خان کی نگرانی میں ۱۰۵۰ھ میں مکمل ہوا تھا، ان باغوں کے علاوہ ظفر خان نے دیگر مغل باغوں کی تجدید و تعمیر میں کافی دل چسپی لی تھی، ان میں دور دراز ممالک سے پھول اور میوہ دار درخت منگوا کر لگوائے تھے، جن میں زنبق، گلاب، گیلاس اور دیگر کئی قسم کے انگور اسی کے عہد میں کشمیر میں آئے۔

ظفر خان احسن نے کشمیر میں عوام کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور عوام کی سہولت کے لیے ہر قسم کا سامان فراہم کر دیا تھا، وہ رات کو عوام کے حالات معلوم کرنے کے لیے شہر کا گشت بھیس بدل کر لگاتا تھا، اس طرح اس کے دور میں امن و امان اور خوش حالی قایم ہوئی تھی، ظفر خان دو دفعہ کشمیر کا گورنر مقرر ہوا تھا، پہلی مرتبہ ۱۶۳۳ء سے ۱۶۴۰ء تک اور دوسری بار ۱۶۷۳ء میں۔

ظفر خان نے شاہ جہاں کے حکم سے باغ فیض بخش کے ساتھ ہی ایک اور باغ کی بنیاد ڈالی اور اس میں چنار، سرو اور دوسرے اقسام کے درخت اور پھول اور طرح طرح کے میوے دار درخت لگانے کا بندوبست کیا گیا، باغ کے وسط میں شاہ نہر بہتی تھی جس کی مدد سے باغ کے تمام فوارے چھوٹتے رہتے تھے، شام کو اس باغ میں چراغاں کیا جاتا تھا، بادشاہ خود موسم بہار میں اس

چراغاں کا لطف اٹھاتا تھا، فواروں کے ساتھ ساتھ چراغوں کی روشنی ایک دل فریب اور دل کش سماں پیدا کرتی تھی، اس کا ذکر ظفر خان نے اپنی ایک مثنوی "کشمیر" میں کیا ہے، اس مثنوی کا مطالعہ کرنے کے بعد ظفر خان احسن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

شاہ جہاں نے کشمیر کا سفر چار بار کیا تھا، تیسری بار جب وہ کشمیر آیا تو یہاں انتیسواں جشن تخت نشینی منایا، شعرا نے قصاید پیش کیے، بادشاہ نے شعرا کو معقول انعام و اکرام کے علاوہ زر و جواہرات اور خلف فاخرہ سے سرفراز کیا، بادشاہ رعایا کو بہت رعایتیں اور مراعات دیتے، ایک کشمیری الاصل شاعر ملا ندیم نے بھی ایک قصیدہ پڑھا، یہ قصیدہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس میں تعریف ہی تعریف نہیں بلکہ رعایا کے دکھڑوں اور مصائب کا بھی ذکر ہے کہ اہل کشمیر کو اس دور میں کن کن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا ؎

چیست آں کس بستن و آویختن فرمود شاہ
شاہ خسرو خاقان کلاہ
سرورا ! دانش پژوہا ! داورا ! دیں پرورا
اہل کشمیر اند در دیوان عدالت داد خواہ
راند انصافت کہ جمع را پریشان دل کہ کرد
آں کہ ہست احسان او جور و ثواب و گناہ
عدلت آگاہ است کہ کایں ابنوہ را بر ہم کہ زد؟
آں کہ یغما را کشادہ در کرم را بستہ راہ
آں ستم کیشے کہ کاہی را عوض گرفتہ کوہ
آں جفا جوے کہ کوہے را بدل نا داد کاہ
عجز ایں قوم از رقوم خانہ بر خواہ خسرو
حال ایں جمع از شکنج نامہ دریا بد نگاہ
عدل فرما کہ ایں قوم از بلا گردد خلاص
دورا ! بر کو کہ ایں جمع از الم یابد بہ جاہ

یہ قصیدہ سن کر بادشاہ کے دل میں ظفر خان احسن سے رنجش پیدا ہوئی تاہم وقت کی نزاکت سمجھ کر ظفر خان احسن کو کشمیریوں کی دل جوئی اور ہم دردی کی تاکید کی، برف و باراں کی تکلیفیں اٹھاتا ہوا بادشاہ لاہور پہنچ گیا، ظفر خان احسن نے ایک مثنوی شہر منزل بادشاہ کی نذر کی جس میں کشمیر کے فطری مناظر کی تعریف و توصیف ہے۔

۱۰۵۵ھ میں کشمیر میں ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا، موضع بدرو واقع پرگنہ آڑدن میں آسمان سے جب کہ مطلع صاف تھا، برف کی ایک مستطیل چادر گری جس کا طول ۷۰ گز اور عرض ۳۰ گز تھا اور ضخامت ۱/۲ ۷ گز تھی جس کی شہادت اور صداقت مرزا علی قلی سلیم کے ان اشارے سے بھی ہوتی ہے ؎

در سال ہزار و پنجاہ اے یار! در گوشہ کاشمر بنگام بہار
ہفتاد گزش طول بہ سی گز عرضش تختۂ برفے افتاد بہ تشکیل بہار

شاہ جہاں نے اس سیاحت میں چشمہ ویری ناگ کی مرمت کا حکم دیا اور چشمہ کے منبع پر ایک آبشار بنوائی جس کے ایک پتھر پر تاریخ آج تک کندہ ہے ؎

حیدر بحکم شاہ جہاں بادشاہ دہر
شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار و جوی
ایں جوی دادہ است ز جوی بہشت یاد
زیں آبشار یافتہ کشمیر آبرو
تاریخ جوی گفت بگوشم سروش غیب
از چشمۂ بہشت بروں آمدہ است جو

اس کے دور میں شاہ جہاں چوتھی بار کشمیر آیا اور ۱۲؍ ربیع الاول کو محفل میلاد دولت خانہ خاص (موجودہ خانقاہ نقشبندیہ) پر منعقد کی اور کشمیر کے علما، فضلا، خطاط، شعرا، لغت خوانوں کو خلعت فاخرہ سے نوازا گیا، بعض علما اور شعرا کے وظایف بھی مقرر کیے گئے اور بعض امرا کو جاگیریں عطا کی گئیں اور اہل کشمیر کو بڑی بڑی دعوتیں کھلائی گئیں اور کھلی کچہری منعقد کرکے مظلوموں کی فریاد سنی اور اس کی دادرسی کی، ظالم افسروں کو اپنے عہدوں سے ہٹایا گیا، بادشاہ ہر صبح و شام یہاں کے باغوں میں لالہ و ریاحین، اشجار سراپا بہار، اثمار رنگین، آبشار ہائے رواں اور شیریں چشموں

سے مشام جام کو معطر کرتا رہا۔

ظفر خان نہ صرف بلند پایہ شاعر ہی تھا بلکہ اعلا درجہ کی صلاحیت رکھنے والا ناقد بھی تھا، وہ مرزا صائب سے شعر و سخن بھی کیا کرتا تھا، رفتہ رفتہ اس کا ذوق اس قدر بڑھ گیا کہ خود مرزا صائب اس کی سخن دانی کا مداح اور قائل ہوگیا۔

ظفر خان صائب کے کلام پر رائے زنی کرتا تھا جس کا اظہار وہ یوں کرتا ہے۔

دو چیز قدر شعر بشکند صائب
سکوت سخن شناس و قدر ناشناس

ظفر خان اس رتبہ کا آدمی تھا کہ کلیم اور صائب دونوں کو اس کی استادی اور مربی گری کا اعتراف ہے، صائب ایک مدت مدید تک اس کے دربار میں رہا اور اس کی بہ دولت شاعری میں ترقی کی، ظفر خان اس کے کلام میں موقعہ بہ موقعہ دخل اور تصرف کرتا تھا، صائب نے اپنے دیوان کی ترتیب بھی اسی کے مشورے سے دی تھی، چنانچہ صائب نے ان سب باتوں کا اعتراف احسان مندی کے ساتھ کیا ہے۔

تو حال ز دخل بجا مصرع را داری
تو در فصاحت وادی خطاب سحبانم
چو زلف سنبل ادبیات من پریشاں بود
نداشت طرۂ شیرازہ روئے دیوانم
تو غنچہ ساختی اوراق باد بردۂ من
وگر نہ خارہا نے ماند از گلستانم

صاحب تذکرۃ الامرا فرماتے ہیں کہ "ظفر خان ایرانیوں کو بہ کثرت روپے دیتا تھا، خصوصاً ایرانی شعرا کے ساتھ خوب بذل و کرم کرتا جو اس کے ہم مسلک ہوتے تھے، ایران کے اکثر شعرا جن کی ایران میں قدر نہ ہوتی تھی، دل برداشتہ ہوکر اس کی بارگاہ میں آتے رہتے تھے اور حسن و احسانات کی توقعات کے ساتھ ان کی مرادیں پوری ہوتی تھیں۔

ظفر خان احسن کے ذوق شعر و سخن اور شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے

کہ اس نے اپنے عہد کے تمام ہم عصر شعرا مثلاً کلیم، قدسی، طالب، بخشی، صائب، سالک، یزدی، سالک قزوینی، دانش وغیرہ کے کلام کو ایک بیاض کی صورت میں ہر ایک شاعر کے دستِ خاص سے لکھوایا تھا اور ہر ایک کی تصویر اس کے ساتھ منسلک کروائی تھی، بہ قول مولانا شبلیؒ اگر آج یہ مرقع ہاتھ آتا تو لاکھوں روپے کو ارزاں تھا، ظفر خان خود صاحب دیوان شاعر تھا۔

کشمیر میں فارسی ادب کو ترقی دینے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا، کیوں کہ اس کے زمانہ میں شاعری کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ کشمیر میں مشاعروں کا رواج ہوا، اس سے پہلے شعرا بہ طور طرح اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں لکھتے تھے لیکن اب یہ طریقہ قایم ہوا کہ کسی امیر کے دربار میں شعرا جمع ہوتے تھے اور ان کو طرح مصرعہ پر غزلیں لکھنے کو کہا جاتا تھا، کبھی کبھی محفل شعر میں نوک جھونک اور چوٹیں بھی ہوتی رہتی تھیں، تنقید بھی ہوتی تھی۔

ظفر خان احسن کے کلام میں چند خصوصیات نمایاں طور پر ملتی ہیں، خیال بندی اور مضمون آفرینی جابہ جا نظر آتی ہے، کہیں کہیں فلسفہ کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے، مثالیہ ان کا من پسند اسلوب ہے، ان کی غزلوں میں عشق و عاشقی کے جذبات موثر الفاظ میں ادا ہوتے ہیں، استعارات کی جدت اور نزاکت کلام ان کا عام انداز ہے، وہ الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا کرتے ہیں۔

اگر چہ ظفر خان کے یہاں وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے اسرار و رموز نہیں پائے جاتے ہیں جو اس دور کے فارسی شعرا کے کلام میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں، تاہم زبان کی صفائی، سلاست روانی اور تراکیب کی بندش اور محاورات کا استعمال ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں، ان کے کلام پر صائب اور غنی کی چھاپ نمایاں طور پر ہے، میر الٰہی کے اسلوب کی بھی پیروی کی ہے۔

دلم بہ کوئے تو امیدوار می آید — نگاہ دار کہ روزے بکار می آید
در گوشۂ میخانہ ہمیں گفت وشنید است — بیاران برسانید و رنج است عید است
در بستان ہند چوں او دل برخود کام نیست — نام را ہم گرچہ می گوید ولیکن رام نیست

کشمیر کی تعریف و توصیف میں ظفر خان نے بہت کچھ کہا ہے۔

الٰہی تا بود کشمیر آباد — زگلزار خراسانم مدہ باد
بہ ہر کس ہر چہ خواہد بے سخن دہ — مرا کشمیر بلبل را چمن دہ

ظفر خان احسن کو دوسری مرتبہ جب کشمیر سے لاہور تبدیل کیا گیا تو کلیم نے یہ غزل کہی جو جذبہ اور شدت سوز کی وجہ سے غزل نہیں بلکہ ایک دردانگیز مرثیہ معلوم ہوتا ہے۔

شکوۂ درد ترا کے بیش درماں می کنم — تشنہ می میریم و لشکر آب حیواں می کنم
بے تو تاریک است کشمیر اے چراغ دیدہ ہا — مایۂ روزیم در شب سیر بستاں می کنم
گل اگر تا سینہ در کشمیر آید چہ شود — ما کہ گل از رشک خونیں در گریباں می کنم
در کمین عشق از بس دیدہ ید و زندہ ایم — بادہ را از چشمِ ساغر نیز پنہاں می کنم
از ظفر خاں بود ایں جمعیت و طرح غزل — با کہ دیگر زلف دیوان را پریشاں می کنم
ماجرای دیدہ می گویم بیش سیل اشک — الٰہی بین اشکوہ کشتی بہ طوفاں می کنم
تا تو رفتی دل بہ فکر خیش افتاد است — گرچہ می بازیم آنگہ فکر ساماں می کنم
بادۂ کشمیر از بزم تو صاحب نشہ بود — بے تو ما خاطر نشان می پرستاں می کنم
داغ پسماندہ کلیم از لالہ زار از دست رفت — ہر چہ دشوار است ما بر خویش آساں می کنم

شاہ جہاں نامہ میں جو اشعار کلیم کے درج ہیں ان میں ظفر خاں کی تعریف کی گئی ہے۔

ظفر خاں ز فتح و ظفر شادماں — بہ کشمیر ازاں مملکت شد رواں

ظفر خان کا باپ سنی مسلک کا پیروکار تھا لیکن ظفر خان امامیہ مسلک پر چلتا تھا، اس لیے دونوں کے تعلقات عام طور پر کشیدہ رہتے تھے، نتیجتاً مسلک کے شعرا اور امرا کو زیادہ انعام دیتا تھا، یہ شکایت شاہ جہاں تک بھی پہنچ چکی تھی۔

اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ ظفر خان احسن اور شیخ محسن فانی کے درمیان زبردست رسا کشی پیدا ہوتی تھی، وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان دنوں کشمیر میں ایک رقاصہ اپنے حسن و جمال اور ناز و ادا کی وجہ سے ایک عالم کو اپنا فریفتہ بنا چکی تھی، مگر وہ دل سے شیخ محسن فانی کی رقاصہ اور محبوبہ تھی، ظفر خان احسن گورنر ہونے کی وجہ سے اس کو مرعوب کر کے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا مگر رقاصہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور کافی انعام و اکرام کی پیش کش کے باوجود وہ رقاصہ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی تھی، یہ بات ظفر خان احسن کو بہت بری محسوس ہوئی اور فانی کو اپنے دربار میں آنے کی اجازت بھی نہ دی، ظفر خان احسن ناراض ہوا اور فانی اور رقاصہ (نچی) کی ہجو کی۔

خفتہ را بیدار ساز و یاد دامان نجی

مردہ را در جنبش آرد بوے انبان نجی

مگر فانی نے خاموشی اختیار کی اور اس کے خلاف اف تک نہ کی بلکہ جب ظفر خان احسن دوسری بار کشمیر کا گورنر بنا تو فانی نے ایک غزل میں اس کی یوں تعریف کی۔

وزید باد بہار و نوید یار آید — بیار بادا کہ یار آمد بہار آمد

بدشت لالہ شگفت و بہ باغ سبزہ رمید — نہال شیشۂ و ساغر بہ برگ و بار آمد

چو روے یار بہ بینی لب پیالہ بہ بوس — کہ فصل توبہ شکن وصل آں بہ کار آمد

بہار گلشن کشمیر باز رنگیں شد — کہ ابر فیض ظفر خاں کامگار آمد

چرا بہ باغ نہ نالد صنوبر و شمشاد — کہ آب رفتہ در آغوش جوے بار آمد

در ایں بہار ز تایید بخت مانی را — عروس دولت و اقبال در کنار آمد

جب فانی الہ آباد میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے تو وہاں بھی وہ ظفر خان احسن کو یاد کرتے تھے۔

گو ظفر خاں داغ شعرا جب کہ فانی ایں غزل

در الہ آباد پیش قدر دانی گفتہ است

ظفر خاں کے دور حکومت میں کشمیر میں شیعہ سنی جھگڑا خطرناک صورت اختیار کر گیا، قاضی شہر کو مداخلت کرنی پڑی، بادشاہ نے ظفر خان کو واپس بلایا اور اس کی جگہ شاہ زادہ مراد بخش گورنر مقرر ہوا، ۱۰۷۳ھ میں ظفر خان نے وفات پائی اور لاہور میں دفن کیا گیا۔

ظفر خان کا کلام ابھی تک شایع نہیں ہوا ہے۔

مثنویات:- مثنوی کا ایک نسخہ خوش خط کتب خانہ رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں موجود ہے، مثنوی کا یہ نسخہ پہلے خود ظفر خان کے پاس تھا پھر ان کے بیٹے کے ہاتھوں میں بھی رہا ہے، اس پر ۱۰۷۳ھ کی تاریخ درج ہے اور لاہور میں لکھا گیا ہے، اس نسخہ پر چند شعرا کی تصویریں بھی ہیں، یہ تصویریں شیین داس بنائی ہیں۔

۲-بیاض شعرا: نادر، نایاب، بہ قول مصنف کلمات الشعرا محمد افضل سرخوش ایک صفحہ شاہ جہاں

کے دربار میں تھا اور کلیم کاشانی کی تصویر اس میں بنی تھی۔

۳-کلیات: یہ خود ظفر خان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے اور بانکی پورہ کے ایک کتب خانہ میں زیر نمبر ۳۲۹ موجود ہے اور یہ کلیات ۱۰۵۳ھ میں ترتیب دیا گیا تھا، کلیات کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ ترتیب دیا گیا تھا اسی سال عنایت خاں آشنا اس کا بیٹا تولد ہوا تھا، طالب کلیم نے اس کی تاریخ لکھی تھی ع گلہا کہ چہ از چمن طبع او شگفتہ شگر - اس سے پہلے ایک اور دیوان ترتیب دیا تھا وہ بھی اس کلیات کے ساتھ شامل ہے۔

۴-ساقی نامہ: ترجیع بند (صفحہ ۱۲ تا ۱۶) اس ساقی نامہ کے ورق ۱۷ تا ۱۵۰ پر غزلیں درج ہیں اور ۱۵ رباعیات بھی درج ہیں، مطلع یہ ہے

چہ گرد و ترنم ساری در قیامت عذر خواہ ما

بہ سوزد خرمن عصیان خلق از برق آہ ما

مثنوی جلوۂ ناز، مثنوی میخانۂ راز۔

۵-کلیات کا ایک اور نسخہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔

۶-دیوان: دیوان کا ایک اور نسخہ کشمیر یونی ورسٹی کے شعبۂ تحقیقات میں موجود ہے، یہ نسخہ نامکمل ہے۔

۷-دیوان کا ایک اور نسخہ انڈیا آفس میں موجود ہے۔

ظفر خان احسن کے ساتھ کشمیر میں مندرجہ ذیل شعرا وابستہ تھے:

۱-نادم گیلانی شاگرد نظیری ۲-رونقی ہمدانی ۳-صوفی ہمدانی ۴-وارستہ ۵-ملا رفقی ۶-میرزا ابراہیم تبریزی (مدفن کشمیر) ۷-میر الٰہی ہمدانی (مدفن کشمیر) ۸-ملا طاہر غنی کشمیری (مدفن کشمیر) راجوری کرل سری نگر ۹-طالب کلیم (مدفن کشمیر) ۱۰-طالب آملی ۱۱-صائب اصفہانی ۱۲-محمد قلی سلیم (مدفن کشمیر) ۱۳-محمد جان قدسی (مدفن کشمیر) ۱۴-محمد مقیم جوہری ۱۵-رضی دانش ۱۶-سالک یزدی (مدفن کشمیر) ۱۷-حکیم ضیاء الدین ۱۸-رکن الدین مسعود ۱۹-قاضی محمد قاسم ۲۰-حیدر حصالی (خطاط) ۲۱-میرزا محمد قزوینی ۲۱-رضا حسینی ۲۳-سید الی زرگر ۲۴-ملا حسین آشوب ۲۵-بشن داس۔

☆☆☆☆

استدراک

از:- ضیاء الدین اصلاحی

اپریل کے معارف میں مولانا مظہر الاسلام قاسمی (آسام) کا جو مضمون "قرآن مجید کے معرب الفاظ" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، اس میں بعض مقامات محل نظر تھے، ان پر نشانات لگا دیے تھے، خیال تھا کہ کمپوزنگ سے پہلے ان پر مختصر نوٹ لکھ دیا جائے گا مگر اسی اثنا میں راقم کو دارالمصنفین سے باہر جانا پڑا اور جاتے وقت جو مضامین کمپوزنگ کے لیے دے گیا تھا، ان میں یہ مضمون بھی چلا گیا، سفر سے واپسی پر وہ لکھا جا چکا تھا اور اب نوٹ کی گنجایش نہیں رہ گئی تھی۔

متذکرہ بالا مقالے میں الفاظ کو جن زبانوں کا بتایا گیا ہے وہ بھی بہت کچھ مشتبہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تحقیق کے لیے فرصت درکار ہے، معارف کے جن قارئین کو اس موضوع سے دل چسپی ہو وہ اگر اس پر لکھیں تو اسے شکریے کے ساتھ شایع کیا جائے گا، سردست چند ایسے الفاظ کی نشان دہی کی جاتی ہے جن کے معنی مقالہ نگار نے یا تو غلط لکھے ہیں یا ان کا مناسب ترجمہ نہیں کیا ہے۔

۱- اَبّ لکھ کر سورۂ عبس کی آیت ۳۱ (وفاكهةً وابًّا) نقل کی ہے اور اس کے معنی باپ اور جمع آبا لکھی ہے (معارف اپریل، ص ۲۶۸)، سورۂ عبس میں آیت مشدد ہے اور جس لفظ کے معنی باپ ہیں وہ غیر مشدد ہے، ان دونوں کے مادے الگ الگ ہیں، سورۂ عبس میں اَبّا کے معنی تر و تازہ اور شاداب گھاس اور چارے کے ہیں، مقالہ نگار نے اس کو مغربی زبان کا لفظ بتایا ہے، مغربی سے ان کی کیا مراد ہے؟ اہل لغت نے اس کو عربی زبان ہی کا لفظ بتایا ہے، ان کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کہ اس لفظ کے معنی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو معلوم نہیں تھے (تفسیر نظام القرآن فراہی، ص ۲۶۹ و ۲۷۰، مطبوعہ ۱۹۹۶ء)۔

۲- اخلد: اس کے لیے حوالہ سورۂ ہمزہ آیت ۳ (اخلده) کا دیا ہے اور معنی لکھے

ہیں "وہ سدا رہا" (معارف، ص ۲۶۸) ترجمہ متعدی کا کرنے کے بجائے لازم کا گیا ہے، صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ "وہ (مال) اس (صاحب مال) کو سدا باقی رکھے گا یا جاوداں یا زندۂ جاوید کردے گا"، صاحب مقالہ نے اسے عبرانی لفظ بتایا ہے، حالاں کہ اس مفہوم میں قدیم عربی شاعری میں اس کا استعمال موجود ہے، غالباً مقالہ نگار کا منشا سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۶ (اخلد الى الارض) سے ہے، یہاں وہ لازم کے معنی میں ہے لیکن اس کا صلہ الی ہے، اس کی وجہ سے اس کا وہ مفہوم جو سورۂ ہمزہ میں ہے تبدیل ہوگیا ہے اور اس میں جھکاؤ اور میلان کا مفہوم پیدا ہوگیا ہے۔

۳- غیض: (ہود: ۴۴) کا ترجمہ کیا "خشک کیا گیا، گھٹایا گیا" (معارف اپریل ص ۲۷۸) زیادہ بہتر اور مناسب ترجمہ "اتر گیا" ہوگا یعنی چڑھا اور پھیلا ہوا پانی کم ہوگیا اور اتر گیا۔

۴- کَفِّرْ: (آل عمران: ۱۹۳) کا ترجمہ "تو دور کر، مٹا دے" معارف ص ۲۸۰) کیا ہے جو غلط نہ سہی لیکن دور کر غیر مناسب ضرور ہے، جس میں اصل لفظ سے انحراف ہے، دراصل "کفر" کے اصل معنی "چھپانا" ہے، اسی لیے کفار کسان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اسی سے اس لفظ میں انکار و جحود کا مفہوم بھی پیدا ہوگیا ہے، اس لیے "دور کر" کے بجائے مناسب ترجمہ "تو چھپا دے، بخش دے، محو کردے" ہوگا۔

۵- قَسْوَرَة: (مدثر-۵۱) کے کئی معنی لکھے ہیں، شور و غل، شیر، تیر انداز، شکاری لوگ (ص ۲۷۹) موقع کے لحاظ سے چاہے ان میں سے ہر معنی سے مفہوم درست معلوم ہوتا ہو مگر لفظ کا اصل معنی تو ایک ہی ہوگا، اس لیے اسی کو لکھنا چاہیے تھا اور اس سے عدول نہیں کرنا چاہیے تھا۔

۶- ھُود: کے معنی یہودی لوگ لکھا ہے اور اسے ہائد کی جمع اور عبرانی لفظ بتایا ہے لیکن حوالہ (الا بعدا لعاد قوم هود، ہود-۶۰) کا دیا ہے، عاد و ثمود عرب کی اقوام بایدہ میں ہیں، عاد کی طرف حضرت ہودؑ کی اور ثمود کی طرف حضرت صالحؑ کی بعثت ہوئی تھی، اس مسلمہ سے انحراف کرکے مولانا وادی تیہ میں کہاں جا پہنچے، اس زمانے میں تو یہودی لوگوں کا کہیں اتا پتا بھی نہیں تھا۔

ترجمے کی ناہمواریاں اور بھی ہیں مگر ان سب سے تعرض کرنا مقصود نہیں۔

☆☆☆

اخبار علمیہ

عرب دنیا میں پہلی بار انگریزی میں مسلم بچوں کے لیے ایک اسلامی مزاحیہ رسالہ Qkids نکلا ہے جو شایع تو سویڈن میں ہوتا ہے مگر اس کی ایڈیٹنگ ریاض میں ہوتی ہے، اس کے چیف ایڈیٹر کے بیان کے مطابق رسالہ اپنے مشمولات اور طرز و اسلوب کے اعتبار سے بچوں کے دوسرے رسالوں سے مختلف و منفرد ہے، یہ مختصر افسانوں اور دل چسپ سبق آموز مضامین پر مشتمل ہوتا ہے، اس تعلیمی و تربیتی اقدام اور رسالے کے اجرا کا مقصد مسلمان بچوں کو ٹی-وی سٹیلائٹ کی تباہ کن عادت سے بچانا اور اسلامی تاریخ و تہذیب سے آشنا کرنا ہے، ان کے خیال میں اس لت میں پڑ کر مسلمان بچے تعلیم سے محروم ہوتے جارہے ہیں، ان غیر صحت مند اور مضر اثرات کے تدارک کے لیے رسالے میں آیندہ صحابہ کرام کے حالات اور سبق آموز واقعات شایع کیے جائیں گے، اس کا آغاز حضرت بلال بن رباح حبشی سے کیا جائے گا، جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد سخت اذیتیں جھیلیں، حضور اکرم ﷺ نے ان کو موذنی کے اہم و باوقار عہدہ پر سرفراز کیا تھا، اس سے نوجوانوں کی ذہنی و فکری نشو و نما میں بڑی مدد ملے گی اور انہیں پتہ چل سکے گا کہ حضرت بلالؓ وغیرہ اپنے اسلامی عقاید پر کس قدر صبر و استقلال سے جمے رہے اور ہمیشہ تختۂ مشق ستم رہنے کے باوجود کفر و الحاد سے کنارہ کش رہنے کو ہی کامیابی سمجھتے رہے۔

برطانوی سائنس داں مارٹن السلے کی سربراہی میں "ایسٹیو رنکنالوجی لیب" میں ایک ایسا آئینہ تیار کیا گیا ہے جس میں مستقبل کی شکل کا عکس نظر آسکتا ہے، رسالہ "سن" کی اطلاع کے مطابق اس تکنک میں ایک کیمرہ ہوگا جو انسان کی موجودہ تصویر لے کر یہ بتادے گا کہ آیندہ بڑھاپے میں وہ کیسا ہو جائے گا، یہ فوٹو، فلیٹ اسکرین والی ال سی ڈی، ٹی وی شیشے پر دکھائی دے گا جو طاقت ور "امیج پروسیسنگ کمپیوٹر" سے جڑا ہوگا، اس پروجیکٹ کو تیار کرنے والے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس سے لوگ اپنی صحت کے بارے میں چوکنا ہو جائیں گے اور احتیاط برتنے لگیں گے۔

اسرائیل میں نیگیو ریگستان کے قریب واقع ایک گاؤں میں رائج زبان پر سائنس داں

تحقیق کر رہے ہیں، ان کے دعوے کے مطابق اس تحقیق سے الفاظ کی شکل و ہیئت، نشو و نما اور اس کے منظم قواعد کے متعلق اب تک کے راز منکشف ہو جائیں گے، "السعید بیدوئن لینگویج" نامی یہ زبان ساڑھے تین ہزار لوگوں میں مستعمل و رائج ہے، اس کے خاص محقق مارک اینوراف کا بیان ہے کہ اس کو بولنے والے اشارات اور ضمایر وغیرہ کا اظہار اپنے حرکات وغیرہ سے کرتے ہیں، ان کا یہ مخصوص اور انوکھا طریقہ ادا ہے، مطالعہ میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ یہ عربی اور اپنے مضافات کی علاقائی زبانوں کے اثر سے بہت حد تک محفوظ ہے، چوں کہ یہ زبان دوسری زبانوں کی آمیزش اور اثر کے بغیر رواج پذیر ہوئی ہے، اس لیے اس کے اسالیب و انداز کو سمجھنا آسان ہے، ممکن ہے اس سے اس بات کا پتہ چلے کہ دنیا کی کس زبان نے سب سے پہلے ترقی کی۔

اسٹین فورڈ سنکرو ٹران ریڈی ایشن لیبوریٹری (برلن) کے سائنس دانوں نے ایسی ایکسرے تکنک ایجاد کی ہے جس سے بال سے بھی ہزار گنا باریک اشیا میں ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ ممکن ہوگا، گویا یہ تکنک "بال کی کھال نکالنے والے" محاورے کو سچ کر دکھائے گی، اس کو "لنس لس ایکسرے ہولوگرافی" کا نام دیا گیا ہے، ۲۰۰۹ء میں سائنس دانوں نے اس کے استعمال کا ارادہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس تکنک سے ایٹم اور جوہری توانائی میں نہایت تیزی سے ہونے والے تغیر کو پہچاننا اور اس کا مشاہدہ کر لینا ممکن ہوگا اور حیاتی، کیمیائی سائنس وغیرہ میں اس کے ذریعہ کامیاب تجربے کیے جاسکتے ہیں، لیونگ کے بیان کے مطابق اس نئی تکنک میں شیشے کا استعمال نہیں کیا جارہا ہے، اس لیے موجودہ ایکسرے کے طریقے کے بالمقابل اس سے کسی بھی شیی کی دس گنا بہتر تصویر لی جاسکتی ہے جو رائج تکنک کے برعکس آسان بھی ہے۔

مغربی بنگال کے مدناپور ضلع کے بیلدا پور گاؤں میں ایک مکان کے احاطہ کی تعمیر کے دوران کھدائی میں دو کتبے دستیاب ہوئے ہیں جن کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ یہ مہاراجہ کلپند ردیو کے عہد کے ہیں اور اڑیہ زبان میں ہیں، ماہرین ان کتبوں سے اڑیہ زبان اور اس کے طریقۂ تحریر کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں، اب تک کے مطالعہ میں انہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس زمانے میں اڑیہ زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی، انہوں نے دعوی کیا ہے کہ ابھی تک سورج بنسی بادشاہوں کے عہد کی کوئی تحریر نہیں ملی تھی مگر ان دونوں کتبوں سے ان کے عہد حکومت کی سیاست،

تاریخ اور تمدن کے متعلق بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ جانے کی توقع بندھ گئی ہے۔

سوئیزرلینڈ میں شمالی مغربی علاقہ "جورا" کی پہاڑی پر سواپندرہ کرور برس قدیم سینکڑوں ڈائنا سوروں کے نشان پائے گئے ہیں، وہاں کے محققین کے بہ قول ڈائنا سوروں سے متعلق تحقیق و مطالعہ میں "جورا" پہاڑی بہت اہم ہے، ماہرین ان ڈائنا سوروں کے نشانوں کے تحفظ اور ان کی پیمایش میں مصروف ہوگئے ہیں، ان کے مطابق ان نبات خور ڈائنا سوروں کے نقوش قدم زمین کے اندر بہت گہرائی تک دھنسے ہوئے پائے گئے ہیں، ماہرین نے اس کی اہمیت کے پیش نظر مشورہ دیا ہے کہ اقوام متحدہ کو اپنے "عالمی وراثتی مقامات" کی فہرست میں اس علاقے کو بھی شامل کرنا چاہیے۔

انٹرنیشنل اسلامک یونی ورسٹی، اسلام آباد کی دعوہ اکیڈمی کا ۲۱واں عالمی پروگرام ۱۲/نومبر تا ۱۹/دسمبر ۲۰۰۴ء کے درمیان منعقد ہوا، اس کا موضوع انسانی وسایل ترقی تھا اور اس میں ۱۳ ملکوں فجی، گیانا، اٹلی، کینیا، ماریشش، میانمار، نیپال، فلپائن، مغربی افریقہ، سری لنکا، یوگینڈا، یو ایس اے اور زامبیا کے ۲۳ مندوبین نے حصہ لیا، عالم اسلام کے محققین اور دانش وروں کی ایک بڑی تعداد بھی اس میں شریک تھی، پروگرام کا مقصد جدید دور میں اسلام کی بنیادی فکر کو اس کے حوالے سے عصری تقاضوں کے مطابق آگے بڑھانا، مسلمانوں کی قایدانہ صلاحیتوں کو بہ روے کار لانا اور انہیں اخوت و بھائی چارگی کے رشتے میں منسلک کرنا تھا، اکیڈمی کے ریکٹر نے کہا کہ اسلام اصلاح وتجدید کا مخالف نہیں لیکن اس کے لیے قرآن وسنت سے وابستگی ضروری ہے، اس میں فرقہ بندی کی بھی کوئی گنجایش نہیں ہے، اس طویل پروگرام کے روزانہ معمولات میں جسمانی ورزش، حفظ وتلاوت قرآن اور اس کا اور احادیث کا مطالعہ و مذاکرہ، لکچر، ورک شاپ اور مختلف ملکوں کی موجودہ صورت حال پر رپورٹ تیار کرنا شامل تھا کہ ہر ہر ملک کی مختصر تاریخ سامنے آجائے اور ان میں مسلمانوں کو درپیش مسایل اور ان کے حل کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا پتا چل جائے، پروگرام میں حسب ذیل چار تجویزیں منظور ہوئیں: (۱) ایک اسلامی ویب سایٹ کا قیام اور اسے موثر وکارگزار بنانا، (۲) ایک خود مختار اسلامک سنٹر کا قیام، (۳) ویلفیر سوسائٹی کا قیام، (۴) ایک اسلامی ادارے کے قیام کا خاکہ اور دستور العمل تیار کرنا۔

پروگرام کے داعیوں نے مندوبین کو مختلف تاریخی مقامات اور پرفضا جگہوں کی بھی سیر کرائی۔

ک۔ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مارچ کا معارف

خالص پور، اعظم گڈھ
۵/مارچ ۲۰۰۵ء

برادر محترم ومکرم، السلام علیکم

مارچ کے معارف میں پروفیسر محسن عثمانی کا مقالہ "شیر ہندوستان - ٹیپو سلطان، شعر وادب کے آئینہ میں" حاصل شمارہ ہے اور بجا طور پر مقالات کا آغاز اس سے کیا گیا ہے، زبان و بیان کا کیا کہنا ؎

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار   رکھ دے کوئی پیمانہ وصہبا مرے آگے

کاش اسی پر کیف انداز میں وہ سلطان شہید کی ایک مبسوط و مستند سوانح بھی قلم بند کردیتے تو ہم سب کا مزید بھلا ہوتا۔

تیس سال قبل میں ایک بین الاقوامی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کرنے میسور گیا ہوا تھا، کچھ دوستوں کے ساتھ سلطان کا مقبرہ دیکھنے گیا تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی مقدس روضہ پر حاضری دے رہا ہوں، محسن صاحب کے مقالے سے اسی احساس و کیفیت قلبی وذہنی کی باز دید ہوگئی۔

شاہ معین الدین احمد ندوی کے حوالہ سے ڈاکٹر الیاس الاعظمی کا کافی محنت سے لکھا گیا مقالہ وقیع اور معلومات افزا ہے، اس سے معارف کے انداز فکر اور شاہ صاحب کے نظریات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اخبار علمیہ میں سائنسی دریافتوں کی خبریں جہاں ہوتی ہیں، ان کی اہمیت سے انکار نہیں، مگر دنیائے علم وادب میں بھی بہت کچھ ہوتا رہتا ہے، اُدھر بھی توجہ کی جائے تو بہتر ہے۔

شذرات حسب معمول خون دل سے لکھے گئے ہیں۔

خاکسار
ابرار اعظمی

وفیات

ڈاکٹر شوقی ضیف

۱۴/۱۵/ مارچ ۲۰۰۵ء کو شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ''دوسری جنگ عظیم کے بعد عربی ادب کے نئے رجحانات'' کے عنوان سے ایک نیشنل سمینار ہوا جس کی روداد اپریل کے معارف میں شائع ہوچکی ہے، اس کے لیے راقم نے ''ڈاکٹر شوقی ضیف: افضل العلما مولانا محمد یوسف کوکن کی نظر میں'' کے عنوان سے مضمون لکھا تھا جس کو ۱۵/ مارچ کو سمینار کے صبح کے اجلاس میں پڑھا، اسی روز شام کو پہلا اجلاس پروفیسر سلیمان اشرف (دہلی) کی صدارت میں شروع ہوا تو انہوں نے یہ افسوس ناک اطلاع دی کہ ابھی خبر ملی ہے کہ ۱۱/ مارچ بہ روز جمعہ ڈاکٹر شوقی ضیف کا انتقال ہوگیا، اسی وقت تاثراتی تقریریں ہوئیں، تعزیتی تجویز منظور کی گئی اور ڈاکٹر صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

سمینار کے مندوبین کو شعبہ عربی کی جانب سے جو کتابیں دی گئی تھیں ان میں ''مجلۃ المجمع العلمی الہندی'' کا تئیسواں شمارہ بھی تھا، اتفاق سے اس میں بھی ڈاکٹر صاحب پر ایک مقالہ شامل تھا، اس سے اپنے مضمون میں کسی قدر اضافہ کرکے معارف کے قارئین کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔

ڈاکٹر شوقی ضیف بیسویں صدی کے عربی زبان کے مشہور مصنف اور بلند پایہ محقق ونقاد تھے، وہ جنوری ۱۹۱۰ء میں مصر کے ایک گاؤں ''اولاد حمام'' میں پیدا ہوئے، ان سے پہلے ان کے دو بڑے بھائی ایام شیر خوارگی ہی میں فوت ہوگئے تھے، اس لیے جب یہ پیدا ہوئے تو ان کے والدین کو بڑی خوشی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا پورا نام احمد شوقی عبدالسلام ضیف تھا، ضیف ان کے خاندان کا لقب اور عبدالسلام والد کا نام تھا، ان کا اصلی نام احمد شوقی تھا مگر وہ اختصار کے خیال سے اپنے کو صرف شوقی ضیف لکھتے تھے، یہی ان کا قلمی نام تھا اور اسی سے ان کو شہرت ملی۔

بچپن میں وہ بیمار ہوگئے تھے، اس کی وجہ سے ان کی بائیں آنکھ میں تکلیف ہوگئی تھی جس کا مناسب علاج نہ ہونے کی بنا پر اس کی بینائی بہت کم ہوگئی مگر داہنی آنکھ صحیح اور سلامت تھی اور اس کی روشنی تیز تھی۔

ڈاکٹر شوقی ضیف کی تعلیم گاؤں ہی میں شروع ہوگئی تھی لیکن جب وہ نو برس کے ہوئے تو ان کے والد اپنے کنبے کے ساتھ دمیاط چلے آئے، یہیں ڈاکٹر شوقی نے ایک برس سے بھی کم عرصے میں قرآن مجید حفظ کیا، جس دن انہوں نے حفظ مکمل کیا تھا، وہ دن ان کے گھر والوں کے لیے بڑی خوشی کا تھا، اس دن ان کے والد نے ایک جلسہ کیا اور ان کے استاذ کو ہدایا وتحائف سے نوازا۔

پہلے مرحلے کی تعلیم دمیاط ہی میں ہوئی، ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء میں وہاں سے باہر جاکر دینی مدرسے میں دوسرے مرحلے کی تعلیم حاصل کی، اس زمانے میں روزنامے اور ہفتہ وار مجلے ان کے مطالعے میں آئے جن سے ان کا تعلیمی رخ تبدیل ہوا اور ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا جہاں ریاضی، طبعیات اور کیمیا وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، اس کے لیے کسی استاذ کی رہنمائی کے بغیر ہی انہوں نے تیاری شروع کی اور ٹسٹ میں کامیاب ہوئے، دو برس تک اعدادی درجے میں رہے، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں قاہرہ یونی ورسٹی کے کلیۃ الآداب کے شعبہ عربی لغت میں ان کا داخلہ ہوا، یہاں ان کی اصلی زبان انگریزی اور ثانوی فرنچ تھی۔

۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے تعلیمی سال میں انہوں نے سریانی اور فارسی زبان پڑھی اور اس کے ساتھ ہی عربی ادب وتنقید اور نحو کا درس بھی لیا، فارسی کے استاذ عبدالوہاب عزام تھے، ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں وہ شیخ مصطفے عبدالرزاق کے لکچروں میں شریک ہوئے جو اسلامی فلسفہ پڑھاتے تھے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی وجہ سے انہوں نے یہاں داخلہ لیا تھا، ان سے نقد النثر اور موازنہ ابی تمام و بحتری کا درس لیا اور ان ہی سے مشہور فرانسیسی مورخ وفلسفی ٹین (Taine) کی تصنیف انگریزی ادب کی تاریخ کا مقدمہ بھی پڑھا، استاذ احمد امین سے علم الاخلاق کی کتابیں پڑھیں۔

۲۶/ برس کی عمر میں ۱۹۳۵ء میں انہوں نے امتیازی نمبروں سے بی اے پاس کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی، اس کے بعد ایم اے میں داخلہ لیا، اس وقت کلیۃ الآداب کے سربراہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین تھے، ان کے مقالے کا عنوان ''ابوالفرج اصبہانی کی کتاب الاغانی میں نقد ادب'' تھا،

یہ اہم کتاب ۱۲/ جلدوں پر مشتمل ہے اور جاہلی اور اسلامی دور کی تین ابتدائی صدیوں کی شاعری اور شعرا کا مرجع ہے، اس کی تیاری میں ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں وہ بہت مشغول رہے، جب اس کا مناقشہ ہوا اور انہیں ڈگری مل گئی تو انہوں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ انہیں اپنی علمی زندگی کے آغاز ہی میں عربی شعر و شعرا کے اس سب سے بڑے اور اہم ماخذ کے مطالعہ کا موقع میسر آیا۔

ایم اے کر چکے تو ڈاکٹر طہ حسین نے ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ''چوتھی صدی ہجری میں عباسی دور کی شاعری'' تجویز کیا، کئی برس کی محنت و مطالعہ کے بعد انہوں نے اپنا مقالہ مکمل کیا اور مناقشے کے بعد ۱۹۴۲ء میں شرف و امتیاز کے ساتھ ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹریٹ کے بعد انہیں قاہرہ یونی ورسٹی کے کلیۃ الآداب کے شعبہ عربی لغت میں تدریس کی خدمت سپرد کی گئی، وہ طلبہ پر نہایت شفیق و مہربان تھے اور ان سے ان کے بڑے مخلصانہ روابط اور تعلقات تھے، ۱۹۴۸ء میں وہ معاون استاذ مقرر ہوئے اور ۱۹۶۸ء میں صدر شعبہ ہوئے، ۱۹۷۰ء میں اس عہدہ سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی اس خدمت کو ۵ برس تک انجام دیتے رہے اور اس کے بعد بھی اس شعبہ میں استاذ متفرغ کی حیثیت سے وہ برقرار رہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے علمی کمالات کی وجہ سے ملک و بیرون ملک کے مختلف علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں، اکیڈمیوں اور کمیٹیوں کے رکن بنائے گئے، ۱۹۸۸ء سے وفات تک وہ مجمع اللغۃ العربیہ قاہرہ کے جنرل سکریٹری رہے، ان کی کئی کتابوں پر مصر کی علمی و ادبی اکیڈمیوں اور انجمنوں اور خود حکومت نے بھی ان کو ایوارڈ عطا کیے، ۱۹۸۲ء میں ان کو عربی ادب کا سب سے بڑا فیصل ایوارڈ ملا۔

۱۹۴۵ء میں ۳۶ برس کی عمر میں ان کی شادی بلقیس خانم سے ہوئی جو قاہرہ یونی ورسٹی کی کلیۃ الآداب میں ان کی شاگرد رہ چکی تھیں، ان سے ایک صاحب زادے عاصم اور صاحب زادی رندہ پیدا ہوئیں، صاحب زادے قاہرہ یونی ورسٹی سے انجینئر نگ کرنے کے بعد انجینئر نگ کالج میں استاذ ہیں اور صاحب زادی میڈیکل کالج سے فارغ ہونے کے بعد اس میں استاذ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے، ان میں مصر ہی نہیں کئی اور ملکوں فلسطین، شام، اردن، عراق اور سوڈان کے بھی شاگرد ہیں، ہندوستان کے مولانا محمد یوسف کوکن مدراسی کو

بھی ان سے شرف تلمذ حاصل تھا، انہیں ۱۹۵۷-۱۹۵۸ء میں حکومت ہند کے وظیفے پر قاہرہ یونی ورسٹی جانے کا اتفاق ہوا تو ڈاکٹر شوقی ان کے استاذ اور تحقیقی مقالے کے نگراں ہوئے، مولانا یوسف مرحوم ایک سامع طالب علم کی حیثیت سے ان کی کلاسوں میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے تھے، جب مولانا یوسف نے ان سے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا کہ وہ مولانا باقر آگاہ ویلوری مدراسی (م ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء) یا مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۵ء) پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فرزدق اور اس کے شعر و ادب پر مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا، چنانچہ موصوف نے پانچ مہینوں میں فرزدق پر بہت سارا مواد اکٹھا کیا لیکن اس کے بعد مصر چھوڑنے کا وقت آ گیا اور وہ اپریل ۱۹۵۸ء میں ہندوستان واپس آ گئے، مصر سے روانگی کے وقت ڈاکٹر صاحب نے انہیں یہ تحریر مرحمت کی:

''قاہرہ یونی ورسٹی کی کلیۃ الآداب اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ سید محمد یوسف کوکن استاذ اردو مدراس یونی ورسٹی ہندوستانی حکومت کے مبعوث ہو کر یہاں آئے اور مارچ ۱۹۵۷ء سے مارچ ۱۹۵۸ء کے اوایل تک شعبہ عربی کے بی اے اور ایم اے درجات میں استاذوں کی درس میں مسلسل شریک ہو کر مستفید ہوئے اور ڈاکٹر شوقی ضیف استاذ ادب عربی کی نگرانی میں عربی ادب میں بحث و تحقیق کا کام بھی کرتے رہے، انہوں نے اموی عہد کے مشہور شاعر فرزدق کے بارے میں مفید اور عمدہ تحقیقات کی ہیں اور بڑی باریک بینی سے فرزدق کے مطبوعہ دیوان کا عالمانہ مقابلہ ان قلمی نسخوں سے کیا ہے جو قاہرہ کے مصری کتب خانے میں موجود تھے، اس کے علاوہ فرزدق کے اشعار میں جن اشخاص و اعلام کا ذکر ہے ان کی تحقیق اور چھان بین بھی کی ہے، ان کی بحث و تحقیق عربیت سے ان کی واقفیت کی دلیل اور نصوص و متون کی تحقیق و تدوین میں مہارت کا ثبوت ہے، انہیں اپنی تحقیق و مطالعہ کا کام برابر جاری رکھنا چاہیے''۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا دستخط اور مہر ثبت ہے جس پر ۳/ مارچ ۱۹۵۸ء کی تاریخ درج ہے مگر مولانا محمد یوسف صاحب ہندوستان آنے کے بعد درس و تدریس اور دوسرے علمی و تصنیفی کاموں میں ایسا مشغول ہوئے کہ فرزدق اور اس کی شاعری پر اپنے ادھورے کام کو مکمل نہیں کر سکے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر شوقی ضیف کو فیصل ایوارڈ ملا، اسی سال ان کے

اس ہندوستانی شاگرد کو عربی کی مسلمہ قابلیت کا پریسیڈنٹ آف انڈیا کا ایوارڈ ملا۔

ڈاکٹر صاحب کے استاذوں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، ان میں ڈاکٹر طہٰ حسین، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر مصطفےٰ عبدالرزاق اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے وہ زیادہ متاثر تھے، قدما میں ثعالبی کے بھی مداح تھے اور اپنے اسلوب تحریر کو جاحظ کے طرز و اسلوب جیسا بتاتے تھے۔

گو وہ ڈاکٹر طہٰ حسین کے زیادہ عقیدت مند تھے تاہم کہیں کہیں ان سے ان کو اختلاف بھی تھا، امیر الشعراء احمد شوقی پر ڈاکٹر طہٰ حسین کی رائے پر نقد کیا ہے۔

ڈاکٹر شوقی ضیف کثیر التصانیف اور کبار مصنفین میں تھے، ان کی تالیف و تصنیف کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا، ۱۳/۱۴ برس کی عمر میں ابن ہشام کی نحو کی کتاب قطر الندی و بل الصدی کا ملخص تیار کیا تھا اور ۱۹ برس کی عمر میں تفسیر مجموعۃ من اجزاء القرآن کے نام سے دوسری کتاب لکھی جو کشاف و بیضاوی کا التقاط ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں انہوں نے مقالہ نگاری بھی شروع کر دی تھی، ان کا پہلا مضمون مجلہ الرسالہ میں ۸ جنوری ۱۹۳۴ء کو ”الوضوح و الغموض فی الشعر“ کے عنوان سے چھپا، یہ مصر کا اہم ہفتہ وار ادبی مجلہ تھا، اس میں جب ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر طہٰ حسین، عقاد اور احمد امین جیسے اہل قلم کے ساتھ اپنا نام چھپا ہوا دیکھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس سے ان کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ فوراً دوسرا مضمون ”ماھیۃ الشعر“ کے نام سے لکھا جو اسی مجلے کے اگلے شمارے میں ۱۵ جنوری کو چھپا، اس کے بعد اور بھی مضامین لکھے اور ان کا اور کتابوں کا تا عمر انبار لگاتے رہے، ذیل میں ان کی اہم تصنیفات کے نام اور کچھ مزید اطلاعات پیش کی جاتی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی سب سے اہم اور معرکہ آرا کتاب تاریخ الادب العربی ہے جو نو جلدوں اور کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے، ہر ہر جلد کی الگ الگ تفصیل ملاحظہ ہو:

۱- جلد اول: اس میں جاہلی عہد کا ذکر ہے، یہ پہلی دفعہ قاہرہ کے دار المعارف سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی اور پھر وہیں سے ۱۹۹۷ء میں اس کا انیسواں اڈیشن نکلا ہے جو ۴۳۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۲- جلد دوم: اس میں اسلامی عہد کا ذکر دو حصوں میں کیا گیا ہے، پہلے حصے میں

اسلام کے ابتدائی دور یعنی عہد رسالت اور خلافت راشدہ کی ادبی تاریخ قلم بند کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں اموی دور کا تذکرہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۳ء میں دار المعارف قاہرہ سے نکلا تھا اور وہیں سے ۱۹۹۷ء میں سترہواں اڈیشن نکلا، یہ ۴۶۱ صفحے کا ہے۔

۳- جلد سوم: اس میں خلافت عباسیہ کے دور اول کی ادبی تاریخ بیان کی ہے، جس کا پہلا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۶۶ء میں نکلا اور ۱۹۹۷ء میں وہیں سے چودہواں اڈیشن نکلا، اس کے صفحے ۵۷۶ ہیں۔

۴- جلد چہارم: یہ خلافت عباسیہ کے دوسرے اور آخری دور کی ادبی تاریخ ہے، اس کا پہلا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۷۳ء میں اور نواں اڈیشن وہیں سے شائع ہوا، صفحوں کی تعداد ۶۶۰ ہے۔

۵- جلد پنجم: اس کا نام عصر الدول والامارات رکھا اور یہ بجائے خود کئی جلدوں میں ہے، اس حصے میں جزیرۂ عرب، عراق و ایران کی مختلف ریاستی حکومتوں اور سلطنتوں کے دور میں عربی ادب کی تاریخ کا تذکرہ ہے، اس کا پہلا حصہ ۱۹۸۰ء میں اور تیسرا ۱۹۹۷ء میں دار المعارف قاہرہ سے شائع ہوا اور ۶۸۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۶- جلد ششم: یہ بھی عصر الدول والامارات ہی کا حصہ ہے اور اس میں شام و مصر کے عربی ادب کی تاریخ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۸۲ء میں اور تیسرا ۱۹۹۷ء میں دار المعارف قاہرہ سے نکلا، اس کے صفحات ۸۴۶ ہیں۔

۷- جلد ہفتم: یہ بھی سلسلۂ دول و امارات کی کڑی اور اندلس کی تاریخ ادب عربی ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۸۹ء اور دوسرا ۱۹۹۷ء میں دار المعارف قاہرہ سے نکلا اور ۵۵۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۸- جلد ہشتم: یہ دول و امارات کے سلسلے کی چوتھی جلد ہے جس میں لیبیا، تونس اور صقلیہ کی تاریخ ادب عربی تحریر کی گئی ہے، اس کا پہلا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۹۲ء میں نکلا تھا جو ۴۴۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۹- جلد نہم: یہ بھی اسی سلسلے کی تاریخ ادب ہے، جس میں الجزائر، مغرب اقصیٰ، مورتیانیا اور سوڈان کا ذکر ہے، اس کا پہلا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۹۵ء میں نکلا اور ۷۰۶ صفحے کا ہے۔

مولانا محمد یوسف کوکن کی نظر سے ڈاکٹر شوقی ضیف کی تاریخ ادب عربی کی صرف ۵ جلدیں گزری تھیں، ان کا مبسوط تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ عربی ادب کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس سے زیادہ مفید اور بہتر کوئی کتاب نہیں، مواد و معلومات کی کثرت کے لحاظ سے یہ ان سب سے فایق ہے۔

۱۰- فصول فی الشعر ونقده : پہلی مرتبہ دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۷۱ء میں چھپی اور وہیں سے تیسری بار ۱۹۸۸ء میں شایع ہوئی اور ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مختلف پہلوؤں سے عربی شاعری کا تحلیلی نقد کیا ہے جیسے عربی ورثہ کی قدر و قیمت، عربی شاعری کی غنائیت و موسیقی، شاعری کے مضامین و ہیئت، عباسی دور کے شعرا کی جدتیں، متنبی کی شاعری میں عربیت، ابو العلا کی شاعری میں فلسفیانہ تفکر، عربی شاعری کی تاریخ میں اندلس کا تشخص و امتیاز، ابن سناء الملک کی شاعری میں مصری روح، ابن الفارض کے روحانی مجاہدات، بوصیری کی نعتوں میں حقیقت محمدی، گزشتہ صدی کی مصری شاعری میں صنایع، نئی عربی شاعری کے تغیرات، آزاد شاعری میں وزن کی شکست و ایقاع، حال کی شاعری کا ماضی سے رشتہ، جدید عربی شاعری میں شوقی کا درجہ و مرتبہ، حافظ کی شاعری کا تاریخی مطالعہ۔

۱۱- دراسات فی الشعرا لعربی : اس کا پہلا اڈیشن قاہرہ کے مکتبہ خانجی سے ۱۹۵۳ء میں نکلا اور ساتواں دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۹۷ء میں طبع ہوا، یہ ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مندرجہ ذیل کو موضوع بنایا ہے:

حافظ ابراہیم کی شاعری میں وطنیت، اسماعیل صبری کے تغزل میں رقت و گداز، احمد محرم کی اسلامی الیڈ، رصافی کی شاعری میں انسانیت اور انسان دوستی، زہاوی کی شاعری کا علمی رنگ، عقاد کی "عابر سبیل" (مسافر) میں روزمرہ کے مسایل و موضوعات، عبد الرحمان شکری کی شاعری میں بدشگونی، خلیل مطران کی شاعری میں آزادی کے نغمے، شابی کے اشعار میں احساس درد و الم کی شدت، ابو شبکہ کی نظم "افاعی الفردوس" میں جنس کی لذت، ایلیا ابی ماضی کی شاعری میں فال، علی محمود طہ کے یہاں چیخنے اور گونجنے والے الفاظ، میخائیل نعیمہ کی "همس الجفون" میں نفسیاتی تاملات، ابوریشہ کی شاعری میں پیکر تراشی، امریکی مہجری شاعری میں مشرقیات کی جھلک۔

۱۲- البلاغة تطور و تاریخ : اس کا پہلا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۶۵ء میں طبع ہوا اور ۱۹۹۷ء میں وہیں سے نواں اڈیشن نکلا، یہ ۳۸۴ صفحے کی کتاب ہے، اس میں جاہلی اور اسلامی دور میں فن بلاغت کی نشو و ارتقا اور عہد بہ عہد ترقی دکھائی ہے اور اس فن کے اور ممتاز اہل کمال کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۳- الفن و مذاهبه فی النثر العربی : اس کو پہلی مرتبہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر قاہرہ نے ۱۹۴۶ء میں اور آخر میں بارہواں اڈیشن دار المعارف قاہرہ نے ۱۹۹۷ء میں شایع کیا، یہ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۴- الفن و مذاهبه فی الشعر العربی : اس کی پہلی اشاعت قاہرہ کی لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر نے ۱۹۴۳ء میں کی تھی اور دار المعارف قاہرہ سے بارہواں اڈیشن ۱۹۹۷ء میں نکلا، یہ ۵۲۴ صفحے کی کتاب ہے، یہ ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا جس پر جامعہ قاہرہ نے جو اس وقت جامعہ فواد قاہرہ کہلاتا تھا، شرف و امتیاز کے ساتھ ڈگری عطا کی تھی اور جب یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شایع ہوئی تو مجمع اللغۃ العربیہ نے ۱۹۴۷ء میں انہیں انعام بھی دیا۔

۱۵- الادب العربی المعاصر فی مصر : پہلا اڈیشن ۱۹۵۷ء میں دار المعارف قاہرہ سے اور وہیں سے ۱۹۹۵ء میں گیارہواں اڈیشن نکلا، یہ کتاب ۳۱۰ صفحے کی ہے، اس میں ۱۸۵۰ء سے ۱۹۵۰ء یعنی سو برس تک کے مصری شعرا اور شعری موثرات و عوامل کا تذکرہ ہے، اس میں مذکور چند مشاہیر شعرا کے نام یہ ہیں، بارودی، حافظ ابراہیم، شوقی، مطران، عبد الرحمان شکری، عباس محمود عقاد، ابراہیم ناجی اور علی محمود طہ، نثر نگاروں کے نام یہ ہیں:

محمد عبدہ، منفلوطی، مویلحی، لطفی السید، مازنی، ہیکل، طہ حسین، توفیق الحکم اور محمود تیمور۔

۱۶- شوقی شاعر العصر الحدیث : اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۳ء میں اور تیرہواں اڈیشن ۱۹۹۷ء میں دار المعارف قاہرہ سے نکلا جو ۲۸۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۱۷- البارودی رائد الشعر العربی الحدیث : طبع اول ۱۹۶۴ء میں اور طبع خامس (پنجم) ۱۹۹۷ء میں دار المعارف قاہرہ سے نکلا جو ۲۳۲ صفحوں میں ہے۔

۱۸- البحث الادبی - طبیعته و مناهجه و اصوله و مصادره : دار المعارف

قاہرہ سے پہلا اور ساتواں اڈیشن ۱۹۷۲ء اور ۱۹۹۷ء میں نکلا، یہ کتاب ۲۸۰ صفحے کی ہے۔

۱۹-الشعر وطوابعہ الشعبیۃ علی مر العصور : دارالمعارف قاہرہ سے پہلا اڈیشن ۱۹۷۶ء میں اور دوسرا ۱۹۸۴ء میں نکلا، صفحات ۲۵۶ ہیں۔

۲۰- تجدید النحو : دارالمعارف قاہرہ سے پہلا اڈیشن ۱۹۸۲ء میں اور چوتھا اڈیشن ۱۹۹۷ء میں نکلا، صفحوں کی تعداد ۲۸۲ ہے۔

۲۱-النقد العربی : دارالمعارف قاہرہ سے پہلی دفعہ ۱۹۶۲ء میں اور آٹھویں دفعہ ۱۹۹۷ء میں چھپی، یہ ۲۵۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۲۲-المدارس النحویہ : دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۶۸ء میں اور ساتویں بار ۱۹۹۷ء میں چھپی، ۳۷۸ صفحے کی کتاب ہے، اس میں نحو کے مختلف اسکولوں کے خصایص بیان ہوئے ہیں اور مشاہیر نحویوں کا تذکرہ ہے۔

۲۳-التطور والتجدید فی الشعر الاموی: پہلا اڈیشن لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر قاہرہ سے ۱۹۵۲ء میں اور دسواں اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۷ء میں نکلا، یہ ۳۴۰ صفحے کی کتاب ہے۔

۲۴-الشعر والغنا فی المدینۃ ومکۃ لعصر بنی امیہ : اس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۵۲ء میں اور وہیں سے ۱۹۹۷ء میں پانچواں اڈیشن بھی نکلا، یہ ۳۳۶ صفحے پر مشتمل ہے۔

۲۵-المقامہ : ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے، پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں اور پانچویں مرتبہ ۱۹۸۰ء میں دارالمعارف قاہرہ سے طبع ہوئی۔

۲۶- مجمع اللغۃ العربیۃ فی خمسین عاما : پہلی بار ۱۹۸۴ء میں قاہرہ کی مجمع اللغۃ العربی سے شایع ہوئی اور ۲۱۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۲۷-تیسیر النحو التعلیمی (قدیما وحدیثا مع نہج تجدیدہ): ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے، پہلی بار ۱۹۸۶ء میں اور دوسری بار ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے شایع ہوئی۔

۲۸-تحریفات العلمیۃ للفصحی : دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۹۴ء میں

طبع ہوئی اور ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۹-الوجیز فی تفسیر القرآن الکریم: پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۴ء میں نکلا اور ۱۰۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۰-تیسیرات لغویۃ : ۱۹۹۶ء میں دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار طبع ہوئی اور ۲۰۰ صفحے کی ہے۔

۳۱-الحضارۃ الاسلامیۃ من القرآن والسنۃ : ۳۳۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار طبع ہوئی۔

۳۲-سورۃ الرحمان و سور قصار : اس میں اپنے سورہ رحمان اور مختصر سورتوں کے مطالعہ کا حاصل پیش کیا ہے جو پہلی دفعہ ۱۹۷۱ء میں اور چوتھی دفعہ ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے چھپی تھی، صفحات کی تعداد ۴۰۶ ہے۔

ان کی جو تصنیفات کسی سلسلے میں داخل ہیں، ان میں سے جن کے نام معلوم ہوسکے، وہ حسب ذیل ہیں:

۳۳-ابن زیدون : ۱۴۴ صفحے پر مشتمل ہے، دارالمعارف قاہرہ سے پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء میں اور گیارہویں دفعہ ۱۹۸۱ء میں طبع ہوئی۔

مذکورہ بالا کتاب سلسلۂ اعلام العرب کی ہے، فنون الادب العربی کے سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابوں کے نام ملاحظہ ہوں:

۳۴-النقد : ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، یہ دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۵۵ء میں اور پانچویں بار ۱۹۸۴ء میں شایع ہوئی۔

۳۵-الرثاء : یہ بھی اسی سلسلے کی کتاب ہے اور ۱۱۲ صفحے پر مشتمل ہے، پہلی دفعہ ۱۹۵۵ء میں اور چوتھی دفعہ ۱۹۸۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے شایع ہوئی تھی۔

۳۶-الترجمۃ الشخصیۃ : یہ پہلی دفعہ ۱۹۵۶ء میں اور چوتھی دفعہ ۱۹۸۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے چھپی اور ۱۲۸ میں ہے۔

۳۷-الرحلات : یہ بھی سلسلۂ فنون ادب عربی میں شامل اور ۱۲۸ صفحے کی ہے جو

۱۹۵۶ء میں پہلی بار اور ۱۹۸۷ء میں چوتھی بار دار المعارف قاہرہ سے طبع ہوئی تھی۔

حسب ذیل کتابیں سلسلۂ اقرأ میں داخل ہیں:

۳۸- الفکاھة فی مصر : دوبار ۱۹۵۸ء اور ۱۹۸۵ء میں دار المعارف قاہرہ نے شایع کی ہے اور ۲۰۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۳۹- مع العقاد : پہلا اڈیشن ۱۹۶۴ء میں اور پانچواں ۱۹۸۸ء میں دار المعارف قاہرہ سے نکلا اور ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴۰- البطولة فی الشعر العربی : یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۴ء میں دار المعارف قاہرہ سے شایع ہوئی اور ۱۶۰ صفحے کی ہے، اس میں وہ قصاید و قطعات نقل کیے گئے ہیں جو جاہلی، اسلامی، رومی، صلیبی اور مغلوں کی جنگوں یا موجودہ دور میں حصول آزادی کے معرکوں میں کہے گئے تھے۔

۴۱- معی، ج - ۱: اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۸۱ء میں اور دوسرا ۱۹۸۵ء میں قاہرہ کے دار المعارف سے نکلا، یہ ۱۳۲ صفحے کا رسالہ ہے۔

۴۲- معی، ج - ۲: اس کا پہلا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۸۸ء میں نکلا جو ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

جو کتابیں تحقیق و تحشیہ کے بعد ایڈٹ کر کے شایع کیں وہ یہ ہیں:

۴۳- تحقیق کتاب الرد علی النحاة لابن مضاء القرطبی : اس کا پہلا اڈیشن دار الفکر العربی قاہرہ سے ۱۹۴۷ء میں نکلا اور تیسرا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۸۸ء میں نکلا، یہ ۱۵۲ صفحے پر مشتمل ہے۔

۴۴- تحقیق خریدة القصر و جریدة العصر للعماد الاصفہانی الکاتب (قسم شعراء مصر) : اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۱ء میں قاہرہ کی لجنة التالیف والترجمہ والنشر نے شایع کیا جو ۲۹۶ پر مشتمل تھا۔

۴۵- رسایل الصاحب بن عباد ۱۹۴۷ء میں پہلی دفعہ دار الفکر العربی سے چھپا اور اب بازار سے غایب ہے۔

۴۶- المغرب فی حلی المغرب (الجزء الاول) لابن سعید الاندلسی : دار المعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۵۱ء میں اور اخیر چوتھا اڈیشن ۱۹۹۷ء میں طبع ہوا اور ۴۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴۷- ایضاً (الجزء الثانی) : یہ حصہ پہلی بار مطبع جامعہ قاہرہ سے ۱۹۵۳ء میں چھپا اور اخیر چوتھا اڈیشن دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۹۷ء میں نکلا اور ۲۷۵ صفحوں پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب بلاد مغرب کی تاریخ ہے جو ابن سعید علی مغربی (۶۱۲ھ-۶۸۶ھ/۱۲۱۴ء-۱۲۸۶ء) کی تصنیف ہے، مصنف مورخ اور شاعر تھے، وہ غرناطہ کے مضافات میں پیدا ہوئے اور تونس میں وفات پائی، ادب و تاریخ سے شغف تھا، اشبیلیہ میں تعلیم حاصل کی، حج بیت اللہ کیا اور حلب، دمشق، موصل، بصرہ، ارمینیا گئے اور اسکندریہ اور تونس میں اقامت پذیر ہوئے، فاتح ہلاکو سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

۴۸- نقط العروس فی تواریخ الخلفاء لابن حزم الاندلسی : یہ کئی جلدوں میں ہے، جزء ثانی ۱۹۵۱ء میں مطبع جامعہ فؤاد قاہرہ سے طبع ہوا تھا۔

۴۹- تاریخ آداب اللغة العربیه لجرجی زیدان : اصل کتاب چار حصوں میں ہے، ڈاکٹر شوقی ضیف نے چاروں پر تعلیقات لکھ کر شایع کیا، اس کا پہلا اڈیشن دار الہلال قاہرہ سے ۱۹۵۷ء میں شایع ہوا۔

۵۰- الدرر فی اختصار المغازی والسیر لابن عبدالبر : پہلا اڈیشن ۱۹۶۶ء میں اور تیسرا اڈیشن ۱۹۹۷ء میں دار المعارف قاہرہ سے نکلا اور ۳۵۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۵۱- التراث والشعر واللغة : دار المعارف قاہرہ سے پہلی دفعہ ۱۹۸۷ء میں چھپی اور ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

پروفیسر سید عبدالرحیم

پروفیسر سید عبدالرحیم کچھ دنوں سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے بالآخر ۱۶ فروری ۲۰۰۵ء کو ناگ پور میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا آبائی وطن ایلچ پور تھا، لیکن وہ اپنے نانہال ''بھی گاؤں''، ضلع امراوتی میں ۱۴؍ اپریل ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے، ایلچ پور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں کے رحمانیہ اردو ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۹۵۴ء میں ناگ پور یونی ورسٹی سے بی اے اور ۱۹۵۶ء میں فارسی میں ایم اے کیا، ۱۹۶۴ء میں اردو میں ایم اے کیا اور کلکتہ یونی ورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا، ۱۹۷۷ء میں ''ارادت خاں'' پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ناگ پور یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

کچھ عرصے تک انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں میں درس کی خدمت انجام دی پھر محکمہ آثار قدیمہ سے وابستہ ہوئے جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی مرحوم تھے، ان کی رہنمائی میں ان کو بھی تحقیق اور تلاش و جستجو کا چسکا لگا اور کتابت و مخطوطات شناسی سے دل چسپی پیدا ہوئی۔

عبدالرحیم صاحب ۱۹۶۸ء میں وسنت راؤ نایک انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز میں اردو فارسی اور عربی کے لیکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۹۸۸ء میں کالج کو انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دیا گیا تو یہ ڈائرکٹر مقرر کیے گئے اور ۱۹۹۲ء میں اسی عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب مہاراشٹر اور گجرات کی مختلف علمی، تعلیمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے وابستہ تھے اور کئی اداروں اور اکیڈمیوں کے ممبر اور بعض کے چیرمین بھی رہے، ان کی نگرانی میں متعدد لوگوں نے علمی و تحقیقی کام انجام دیے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی، ان کا ایک بڑا کارنامہ تذکرہ مشاہیر برار ہے، جس کا پہلا حصہ ۱۹۸۸ء میں چھپا اور دوسرا حصہ ان کے انتقال سے کچھ ہی پہلے شایع ہوا، ان کی ایک کتاب ''ذکر میر غلام احمد حسن'' ابھی زیر طبع ہے، ''کلمات'' اور ''تذکرہ حضرت شاہ سید بدرالدین عرف دادا حیات قلندر'' بھی ان کی تصانیف ہیں، دینی مدارس کی مسلم بچیوں کے نصاب کے لیے بہشتی زیور کا انتخاب مرتب کیا تھا اور عربی سکھانے کے لیے ''عربی سیکھیے'' لکھی، انگریزی میں کیٹلاگ آف عربک پرشین اینڈ اردو انسکرپشن آف سنٹرل انڈیا لکھی۔

ڈاکٹر صاحب کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں ''جنگ نامہ شاہ دولہا رحمن غازی'' منظوم، تاریخ برار از عبدالرزاق ذاکر وغیرہ ہیں، حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کے عربی، فارسی اور اردو

مخطوطات کی جو چھ جلدیں شایع ہوئی ہیں، ان کے مرتبین میں ان کا نام بھی ہے، ان کی بعض کتابیں ابھی شایع نہیں ہوسکی ہیں جیسے آثار برار، ارادت خاں واضح اور مکتوبات شاہ غلام حسن ایلچ پوری۔

پروفیسر عبدالرحیم کو فارسی زبان و ادب کی نمایاں خدمات کے صلے میں صدر جمہوریہ کی جانب سے ایوارڈ بھی ملا تھا۔

انہیں علم و ادب اور تاریخ سے بڑا شغف تھا، برار کے علمی ورثے، وہاں کے علمی خانوادوں اور اشخاص و مقامات پر ان کی گہری نظر تھی، وہ خود بھی برار سے متعلق تحقیق و جستجو میں مصروف رہتے تھے اور دست یاب کتب کی ترتیب و تدوین کا کام دل چسپی سے انجام دیتے رہتے تھے اور اپنے تلامذہ کو بھی اس کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔

مرحوم سے میری واقفیت ان کے مضامین کی وجہ سے تھی جو معارف میں چھپے، احمد آباد میں ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم نے خاص طور سے ان سے ملایا اور پھر درگاہ پیر محمد شاہ کے سمیناروں میں برابر ان سے ملاقات ہوتی جن میں وہ پابندی سے شریک ہوتے تھے، ڈاکٹر ڈیسائی ان سے بہت مانوس تھے اور وہ بھی ڈاکٹر صاحب کا بڑا اعزاز و اکرام کرتے تھے، سمینار کے مقالات کے جلسے نئے تعمیر شدہ ہال میں اوپر ہوتے تھے جہاں پہنچنے کے لیے کئی زینے طے کرنے پڑتے تھے، ایک دفعہ ضیاء الدین صاحب کا یہ پیام مجھے اوپر کے ہال میں ملا کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں صبح افتتاحی جلسے میں نہیں آسکا، معلوم ہوا کہ تم آئے ہو تو ملنے کے لیے آگیا مگر اوپر چڑھنا میرے بس میں نہیں، میں نیچے عبدالرحیم صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوں، اگر آجاتے تو ملاقات ہوجاتی، میں ان سے ملنے آیا تو دیکھا کہ عبدالرحیم صاحب بہت مودب اور سراپا نیاز بنے ڈیسائی صاحب کی ہر فرمایش پوری کررہے ہیں، میری جانب ڈیسائی صاحب کا التفات سوا دیکھ کر عبدالرحیم صاحب کا التفات بھی بہت بڑھ گیا تھا اور جب ملتے تو بڑے انشراح سے ملتے۔

پروفیسر عبدالرحیم صاحب ایک صوفی منش بزرگ تھے، شکل و صورت بڑی پاکیزہ اور نورانی تھی، چہرے بشرے سے تقدس، تقویٰ، خشیت، زہد، کثرت عبادت اور گداز قلب کا اندازہ ہوتا تھا، تبلیغی تحریک سے تعلق تھا، نماز اور اذکار کا بڑا اہتمام کرتے، فجر کی نماز کے لیے بہت پہلے مسجد جاتے اور تہجد و تلاوت میں مصروف رہتے، اخلاص، بے نفسی، سادگی، انکسار، تواضع، متانت اور کم سخنی ان کا

طرۂ امتیاز تھا، اللہ تعالیٰ بہشت بریں میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل بخشے، آمین۔

آہ جناب امیر احمد صدیقی

یہ خبر بھی بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۲۳؍ مارچ کو مشہور ادبی ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ کے سابق مدیر جناب امیر احمد صدیقی نشاط گنج میں اپنی رہائش گاہ پر وفات پاگئے، ان کا آبائی وطن لکھنؤ کے مضافات میں اجریاؤں تھا، وہیں تدفین ہوئی، ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔

وہ ۱۹۴۸ء میں محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش سے اس وقت منسلک ہوئے تھے جب جناب علی جواد زیدی، صباح الدین عمر، فرحت اللہ انصاری اور خورشید احمد صاحب اس سے وابستہ تھے، اب اس دور کی تنہا یہی یادگار رہ گئے تھے، آخر وہ بھی چل بسے۔

مرحوم مختلف وقتوں میں محکمہ اطلاعات میں افسر اطلاعات، فیچر رائٹر، جوائنٹ اڈیٹر، اڈیٹر نیا دور اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر اردو رہے اور اپنے رفقائے کار میں تنہا ان ہی کو ملازمت میں ڈھائی سال کی توسیع ملی تھی۔

نیا دور ہی کے وسیلے سے ان سے میرے تعلقات کی ابتدا ہوئی، میں نے جب اس میں مضامین لکھنا شروع کیا تو اس وقت یہ اس کے جوائنٹ اور خورشید احمد صاحب چیف اڈیٹر تھے، مضامین کی وصولی کی رسید اکثر ان ہی کی جانب سے آتی تھی اور جب یہ اڈیٹر ہوئے تو برابر خط و کتابت رہتی اور فرمائش کر کے مضامین طلب کرتے تھے، امیر احمد صاحب کے دور ادارت کا اصلی امتیاز نیا دور کے خاص نمبر ہیں جو بڑی تعداد میں نکلے اور بہت مقبول ہوئے، کئی خاص نمبروں میں ان ہی کے اصرار کی وجہ سے میں نے مضامین لکھے۔

کسی تقریب یا اردو اکیڈمی کے سمیناروں میں جاتا اور وہ موجود ہوتے تو بڑے تپاک سے ملتے، اپنے گھر بھی مدعو کرتے، ان کو معلوم ہو جاتا کہ میں آیا ہوں تو میری قیام گاہ کا پتہ لگا کر فون کرتے اور اپنے آفس بلاتے اور کہتے کہ گھر کے مقابلے میں یہاں آنا آسان ہے۔

صدیقی صاحب بہت خوش خط تھے، ان کی اردو اور انگریزی تحریریں بڑی خوش نما اور پاکیزہ ہوتی تھیں، انگریزی کی ڈرافٹنگ بہت اچھی کرتے تھے، آج کل دفاتر والے کئی کئی بار بلکہ

کئی کئی دن دوڑائے بغیر کام نہیں کرتے مگر وہ ضرورت مندوں کے کام کرنے میں ٹال مٹول اور انہیں دق نہیں کرتے تھے، اُدھر لوگوں سے ملتے جلتے اور باتیں بھی کرتے رہتے تھے اور اُدھر ضروری دفتری کام بھی نپٹاتے جاتے تھے، زبان اور املے کی غلطیاں ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہتی تھیں، ''نیا دور'' میں تلاش کے باوجود مجھے کبھی کوئی غلطی نہیں ملتی تھی، ایک بار میں نے ان سے مذاقاً کہا کہ تصحیح کی مکمل کوشش کے باوجود معارف اور دارالمصنفین کی کتابوں میں غلطیاں رہ جاتی ہیں، آخر آپ کے پاس کون سا جادو منتر ہے، وہ ہمیں بھی بتا دیجیے، تو خوب ہنستے رہے اور کہنے لگے اصلاحی صاحب اس جادو کا نام توجہ، غور، دھیان اور غلطیوں کی پرکھ کی صلاحیت ہے۔

ادھر بہت دنوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، اب اچانک اخبار میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو بڑا صدمہ ہوا اور ان کا بھولا بھالا اور خلوص و محبت سے بھرا پیکر نظر کے سامنے پھرنے لگا، مرحوم بڑے خلیق، خاموش طبع اور منکسر المزاج تھے، ان کی زندگی تکلف و تصنع سے بری اور غرور و گھمنڈ کے شائبے سے پاک تھی، وہ اہل علم و ادب کے قدرداں، اپنی تہذیب اور اپنی زبان کے عاشق و شیدائی تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ ''ض''

مطبوعات جدیدہ

سیرت پیغمبر اسلام ﷺ : از علامہ محمد غزالی، مترجم جناب مولانا ابو مسعود اظہر ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۱۶، قیمت: ۱۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ اشاعت القرآن ۴۱۵۹، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۶۔

ذکر رسول اکرم ﷺ کا ایک نمایاں امتیاز بلکہ اعجاز یہ بھی ہے کہ جب جب یہ زبان و قلم پر آتا ہے تو ایک نئی لذت و سرشاری سے ہم کنار کرتا ہے، زیر نظر سیرت پیغمبر خاتم ﷺ سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے جس میں آں حضور ﷺ کی سیرت کے احوال پیدائش سے لقائے رفیق اعلا تک وہی ہیں جو ہر کتاب سیرت کا سرمایہ ہیں لیکن فاضل مصنف کے فکر و اسلوب نے ذکر و بیان کو ایک جدا اور بڑا دل کش رنگ دے دیا ہے، یہ عام سوانح عمریوں کی وجہ تالیف و مطالعہ کے محدود مفہوم سے بایں معنی جدا ہے کہ اس میں قدیم و جدید مورخوں اور سیرت نگاروں کے طریقوں کو نئے انداز میں ملا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی روایات کا استیعاب و استقصا اور ان میں باہم ربط و تعلق کی تلاش، اس کے لیے وہ خود سوالات قایم کرتے اور پھر ان کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ مصنف اپنے گرد و پیش کی مسیحی اور یہودی دنیا اور ان کی ترجمان استشراقی ذہنیت کے رد و ابطال کا فریضہ بھی بڑی حکمت و دیانت سے ادا کرنے کے لیے کوشاں ہیں لیکن اس سے بھی اہم بات خود سیرت کے باب میں امت مسلمہ کا رویہ ہے جس کا اظہار یوں کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ کی محبت واجب ہے، اس میں کسی مومن کو شک نہیں لیکن اس جذبہ محبت کو وفاداری کا مظہر کیسے بنایا جائے، یہ تشریح طلب ہے، محبت اگر صرف لفظی ہے تو اس کا اظہار آسان ہے لیکن اگر یہ اطاعت و اتباع کی متقاضی ہے تو یہ یقیناً گراں قدر اور دشوار گزار ہے، اسی لیے اصل مطلوب بھی یہی ہے، کتاب کے پہلے باب میں ”آخری رسالت کا مزاج“ اسی جذبے کی عکاسی ہے، روایتوں کے متعلق انہوں نے شروع میں واضح کر دیا کہ احادیث و روایات کے قبول میں ذہنی بیداری سے کام لینا ضروری ہے، مسلمانوں کو موضوع حدیثوں سے اتنی تکلیف نہیں جتنی ان حدیثوں سے جن کے مفہوم اور موقع و محل کو صحیح طور پر سمجھا

ہی نہیں گیا، خرق عادت کے باب میں یہ کہنا بھی محل غور ہے کہ خرق عادت واقعات کا تعلق توحید سے ویسا ہی ہے جیسا توحید کے علم کا تعلق نجوم یا فلکیات سے ہے یعنی دین کی حقیقت ان بحثوں سے مثبت یا منفی دونوں اعتبار سے دور ہے، حقیقت یہ ہے کہ حیات و دعوت نبوی دونوں کو اللہ تعالیٰ نے اسباب و مسببات کے قوانین کے مطابق منظم کیا تھا، حضور ﷺ کی ولادت کے دن اور مہینے کی تعیین کی بحث کو شاید اس لیے نظر انداز کر دیا گیا کہ یہ معمول کے مطابق تھی، یوم ولادت کی تعیین اسلامی لحاظ سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں رکھتی، شق صدر کے واقعہ کے متعلق مصنف کا یہ بھی کہنا ہے کہ سنت میں بہت سے ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے حقیقت و مجاز کے اسلوبوں سے واقف ہونا ضروری ہے، پوری کتاب میں اسلام کی سربلندی کے لیے سیرت طیبہ کے مطالعہ و اتباع کے لیے مصنف کا جذبہ سطر سطر سے نمایاں ہے، ترجمہ میں زبان و بیان کی سلاست ہے، مصنف مرحوم کے ایک مختصر تعارف کی شمولیت البتہ مناسب ہوتی۔

اشاریہ دل گداز : از جناب محمد قمر سلیم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت: ۱۷۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کے رسالہ دل گداز کا نام بھی اب عام ذہنوں میں مشکل سے ہوگا، اس کی یاد اور ذکر اب داستان پارینہ کا حصہ ہے لیکن اشاریہ سازی خصوصاً اردو کے قدیم اور اہم رسائل کی اشاریہ سازی کے موجودہ رجحان کی برکت ہے کہ اردو کے ان خزانوں کی قابل ستایش یافت و شناخت ممکن ہوتی جاتی ہے، ۱۸۸۷ء سے ۱۹۱۸ء بلکہ اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک اردو کے عہد زریں میں دل گداز کی ایک شان تھی، مولانا شرر کی تاریخ نویسی اور ناول نگاری کی شہرت نے ان کے ادبی مقام اور اس سے بڑھ کر تحریک آزادی ہند میں ان کی خدمات، ان کی حب الوطنی، اتحاد اقوام کی خواہش اور اپنی قوم کے لیے اصلاحی کوششوں ۔ ۔ ۔ کو یقیناً کچھ ہلکا کر دیا لیکن اگر دل گداز کے صفحات پیش نظر ہوں تو ان کی یہ خوبیاں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آسکتی ہیں، اس قابل قدر اشاریے نے اس راہ کے محققین کے لیے واقعی بڑی آسانیاں فراہم کر دی ہیں، لائق اشاریہ نگار ممبئی میں انجمن اسلام کے اکبر پیر بھائی کالج میں استاذ ہیں، انہوں نے قریب بتیس سال کے دل گداز کے شماروں کو حاصل کر کے بڑے سلیقے سے تاریخی اور الف بائی طرز سے مضامین

کو مرتب کرنے کے علاوہ مولانا شرر کی شخصیت اور دل گداز کی اہمیت کو تاریخی اور تنقیدی لحاظ سے بھی پیش کردیا ہے، شروع میں ایک باب میں اشاریہ سازی کیا ہے؟ کے عنوان سے اس فن پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے، اس سے ان کی سخت محنت اور تلاش و تحقیق میں دیدہ ریزی کا احساس ہوتا ہے، ڈاکٹر یونس اگاسکر کا یہ یقین بجا ہے کہ اس اشاریے سے اردو تحقیق کے مطبوعہ سرمایے میں اضافے کے ساتھ نوجوان محقق کی علمی و ادبی شناخت بھی نمایاں ہوگی۔

اسلام میں دعا کا نظام مع مسائل و احکام: از مولانا محمد حسن ندوی و مولانا اخلاق احمد کریمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۶۰، قیمت: ۶۰ روپے، پتہ: مکتبہ نعیمیہ، دیوبند سہارن پور، یوپی۔

مسنون و ماثور دعاؤں کے مجموعوں کی کمی نہیں، دعا کی اہمیت کے پیش نظر وقتاً فوقتاً منتخب دعاؤں کی کتابوں کی اشاعت کا مبارک فریضہ ادا کیا جاتا رہا ہے، زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے میں شامل ہے لیکن اس میں دعا اور متعلقات دعا کے تمام گوشوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ زیادہ مفید ہوگیا ہے، مثلاً دعا کا لغوی مفہوم، اسلام اور غیر مذاہب میں دعا کی حقیقت، مومن و غیر مومن کی دعاؤں کا فرق، قبولیت دعا کی صورتیں اور نبی کریم ﷺ اور انبیائے کرام علیہم السلام اور حضرات صحابہؓ کی دعا وغیرہ عنوانوں کے تحت موثر اور دل نشیں معلومات کو لائق مولفین نے بڑی محنت اور سلیقہ سے یکجا کردیا ہے، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا عبداللہ معروفی اور ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی کی موثر تحریروں سے بھی کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

حقائق اسلام: از ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۵۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اسلام کی حقانیت کو کبھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا لیکن معترضین کبھی خاموش نہیں رہتے، ان کے مسکت و مدلل جواب بھی دیے گئے لیکن ان کا اعادہ شد و مد سے ہوتا رہتا ہے، ان میں حجر اسود کی تعظیم، حضرت عائشہؓ کی کم سنی، کثرت ازواج مطہرات اور ان کی موجودگی میں باندیوں کا جواز، جہاد و قتال، خانہ کعبہ کی اہمیت، پردہ، حلالہ اور گوشت خوری وغیرہ شامل ہیں، موجودہ معترضین کی ذہنیت

کو مدنظر رکھ کر اس کتاب میں ایک بار پھر ان کا نہایت معقول و مدلل جواب دیا گیا ہے، غیر مسلموں کے علاوہ مسلمانوں کے لیے بھی یہ فایدہ مند ہے، دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

خزینۂ واصف (مجموعۂ غزلیات) حصہ اول: از جناب حکیم محمد مرزا واصف ردولوی مرحوم، مرتبہ ڈاکٹر انور حسین خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۸۰، قیمت: ۷۵ روپے، پتہ: ڈاکٹر نہال رضا، عسکری کلینک، ردولی، بارہ بنکی اور دانش محل، امین آباد پارک، لکھنؤ۔

ردولی کی بستی محتاج تعارف نہیں، اودھ کی قصباتی زندگی کے تمام اوصاف کی نمایندگی اس مردم خیز قصبے نے ہمیشہ شان سے کی، مذہبی اقدار کے ساتھ علم و اخلاق اور شعر و ادب میں اس کی روایات بڑی تابناک ہیں، دور زوال میں بھی ان کی چمک کسی نہ کسی درجے میں برقرار رہی، ماضی قریب میں وہاں حکیم مرزا واصف کی شخصیت اودھ کی افسانوی تہذیب کا بہترین نمونہ تھی، قصبہ میں وہ حکیم ممدو کی عرفیت سے معروف خاص و عام تھے، ان کی طبابت کی شہرت کی وجہ سے ان کے اور اوصاف و فضایل خصوصاً شعر گوئی پر نظر کم گئی، قدرت کلام، کہنہ مشقی، اودھ کی لسانی سلاست اور نرمی اور لکھنؤ کے رنگ کی آمیزش کا تقاضا تھا کہ ان کی شاعری سے خاطر خواہ اعتنا کیا جاتا، اب اس ضرورت کو لائق مرتب نے زیر نظر مجموعہ کی شکل میں بہ حسن و خوبی پورا کردیا ہے، حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت پر مرتب کے سیر حاصل مضمون سے معلوم ہوا کہ قصاید و قطعات و رباعیات کا سرمایہ اب بھی منتظر طباعت ہے، اس خزینے کا پہلا حصہ صرف غزلوں کے لیے وقف ہے، بلند و پاکیزہ خیالات اور نہایت شایستہ و شستہ اور بامحاورہ زبان نے غزلوں کو کیف و سرور عطا کردیا ہے، لائق مرتب داد و تحسین کے لائق ہیں کہ انہوں نے ایک بیش قیمت خزینے سے قدر دانوں کو روشناس کرایا۔

سلام بحضور خیر الانام ﷺ: از ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی، قیمت: ۴۰ روپے، پتہ: 4/118-A، لوکو کالونی (نئی آبادی) علی گڑھ۔

خوش گو اور نیک خو شاعر نے حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں نذرانہ سلام اس طرح پیش کیا کہ یہ ملت کی زبوں حالی اور بدعملی کا مرثیہ ہوگیا، اس کے علاوہ چند نہایت پر اثر نعتیں بھی ہیں۔

دار المصنفین کا سلسلہ ادب و تنقید

		Pages	Rs
۱۔ شعر العجم اول (جدید محقق ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	248	85/-
۲۔ شعر العجم دوم	علامہ شبلی نعمانی	214	65/-
۳۔ شعر العجم سوم	علامہ شبلی نعمانی	192	35/-
۴۔ شعر العجم چہارم	علامہ شبلی نعمانی	290	45/-
۵۔ شعر العجم پنجم	علامہ شبلی نعمانی	206	38/-
۶۔ کلیات شبلی (اردو)	علامہ شبلی نعمانی	124	25/-
۷۔ شعر الہند اول	علامہ شبلی نعمانی	496	80/-
۸۔ شعر الہند دوم	علامہ شبلی نعمانی	462	75/-
۹۔ گل رعنا	مولانا سید عبدالحئی حسنیؒ	580	75/-
۱۰۔ انتخابات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	424	45/-
۱۱۔ اقبال کامل	مولانا عبدالسلام ندوی	410	75/-
۱۲۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	402	50/-
۱۳۔ صاحب المثنوی	قاضی تلمذ حسین	530	65/-
۱۴۔ نقوش سلیمانی	مولانا سید سلیمان ندوی	480	75/-
۱۵۔ خیام	مولانا سید سلیمان ندوی	528	90/-
۱۶۔ اردو غزل	پروفیسر یوسف حسین خاں	762	120/-
۱۷۔ اردو زبان کی تمدنی تاریخ	عبدالرزاق قریشی	266	40/-
۱۸۔ مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام	عبدالرزاق قریشی	236	75/-
۱۹۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	70	15/-
۲۰۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	358	70/-
۲۱۔ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (اول)	خورشید نعمانی	422	140/-
۲۲۔ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (دوم)	خورشید نعمانی	320	110/-
۲۳۔ موازنہ انیس و دبیر	علامہ شبلی نعمانی	312	95/-